سکندر علی وجد

شاعر و شخص

اختر جہاں

پہلی اشاعت — فروری ۱۹۹۱ء

تعداد — ۵۰۰ - پانچسو

کتابت — ابو رضوان کرنول

طباعت — نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چار کمان حیدرآباد

نام مصنف — اختر جہاں

پتہ
مکان نمبر 11 / 210
امین پیر روڈ
کرنول — 518001

ناشر — نیشنل بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد - اے پی

انتساب

والد محترم

جناب محمد عبدالقادر صاحب کے نام

جن کی تعلیم و تربیت سے آج میں اس قابل ہوئی

اختر جہاں

فہرست

مرحوم جامعہ عثمانیہ کے فیض یافتگان شعراء میں جو تمام خصوصیت
کے حامل ہیں ان میں سکندر علی وجد کا نام بھی بہت اہمیت رکھتا
ہے۔ جامعہ عثمانیہ اپنے شاندار ماضی اپنی منفرد تہذیب و خوش آئند
روایت کے باعث ہمیشہ ہی سرخرو رہا۔ وجد اسی روایت کے شیدا
کلاسکیت کے وارفتہ اور رومانیت کے والہ ہیں۔ انھوں نے متذکرہ
بالا تمام خصوصیات کو رگ شعر میں رواں کر دیا اور ساتھ ہی شعریت
کی شیرینی اور غنائیت کی چاشنی سے بھی اپنے کلام کو مزین کیا۔
اس کے علاوہ احوال گذشتہ اور مسائل حال کی بھی ان کے کلام
میں ترجمانی ملتی ہے۔ حب الوطنی کی خوشبو سے بھی ان کا کلام
مہکا ہوا ہے۔ و نیز ان کی حدیث دل بھی اس میں پڑھی جا سکتی ہے۔

فہرست

مرحوم جامعہ عثمانیہ کے فیض یافتگان شعراء میں جو تمام خصوصیت کے حامل ہیں ان میں سکندر علی وجد کا نام بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جامعہ عثمانیہ اپنے شاندار ماضی اپنی منفرد تہذیب و خوش آئند روایت کے باعث ہمیشہ ہی سرخرو رہا۔ وجد اسی روایت کے شیدا کلاسکیت کے وارفتہ اور رومانیت کے والہ ہیں۔ انھوں نے مندرجہ بالا تمام خصوصیات کو رگ شعر میں رواں کر دیا اور ساتھ ہی شعریت کی شیرینی اور غنائیت کی چاشنی سے بھی اپنے کلام کو مزین کیا۔ اس کے علاوہ احوال گذشتہ اور مسائل حال کی بھی ان کے کلام میں ترجمانی ملتی ہے۔ حب الوطنی کی خوشبو سے بھی ان کا کلام مہکا ہوا ہے۔ و نیز ان کی حدیث دل بھی اس میں پڑھی جا سکتی ہے۔

ایسے باکمال شاعر کو موضوع تحقیق نہیں بنایا گیا۔ اس کی ایک وجہ خود وحید کی خودنگہداری بھی ہے کہ مقامی درسگاہوں میں تحقیق کیلئے وحید کے فن پر قلم اٹھانے کی جرأت بہت کم ہوئی اور اگر کسی صاحب نے یہ جرأت کرنی بھی چاہی تو سن گن پاتے ہی وحید نے متعلقہ کالج کے پرنسپل کو خط لکھ کر اس سے باز رکھا یا پھر خود محقق سے چند بے سروپا سوالات کر کے اس کا قافیہ تنگ کر دیا اور اس کو یہ باور کر دیا کہ وہ اس موضوع پر تحقیق کا مستحق نہیں

وحید کا تعارف سنہ ۱۹۷۸ء میں خود ان کے ایک مضمون "میں اور میرا فن" سے ہوا تھا۔ جو ان دنوں ہفتہ روزہ بلٹز میں شائع ہوا تھا۔ وحید کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے ان کے اشعار کو پہلے بھی کہیں پڑھا یا سنا ہے۔ حالانکہ یہ ان کی شخصیت اور ان کے کلام سے پہلا تعارف تھا۔ بعد ازاں ایم۔ اے کے امتحان کرنے کی غرض سے کئی موضوعات پر نظر گئی لیکن اس موضوع سے واپس نہیں لوٹی اور میرا تحقیقی موضوع "سکندر علی وجد شخصیت اور فن" طے پایا۔

مواد کی فراہمی کے سلسلے میں کئی مرتبہ حیدرآباد کے سفر

کرنے پڑے۔ کئی نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ وحید کے پہلے مجموعۂ کلام "لہو ترنگ" کی عدم دستیابی بھی ایک مسئلہ بن گئی تھی۔ مختلف کتب فروشوں سے منفی جواب ملا۔ حیدرآباد کے کتب خانوں میں بھی اس کی تلاش بے سود رہی۔ ایسے ہی دشوار گزار راستوں میں لغزش پا کا اندیشہ رہتا ہے۔ تاہم میں اپنے نگران محترم پروفیسر سلیمان اطہر جاوید کی عمیق دل سے سپاس گزار ہوں کہ انھوں نے میری شکستہ ہمت کو حوصلہ بخشا۔

"موضوع کی تبدیلی ضروری نہیں کام جاری رکھئے
کہیں نہ کہیں مجموعہ کلام بھی مل جائے گا۔"

اور ہوا بھی یہی کہ ایک موقع پر محترم پروفیسر ہاشم علی صاحب نے یہ مژدہ سنایا کہ وحید کا مجموعہ "لہو ترنگ" میسور یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے تو خاصا اطمینان ہوا۔ یوں مجھے اس کے مطالعے کا موقع ملا۔

شاعر کو اپنے روزمرہ عام حالات میں دیکھتے خود اپنی شخصیت اور شاعری کے بارے میں ان کے تاثرات سے واقف ہونے کیلئے تسوید مقالہ سے پہلے وحید صاحب سے ملنا چاہتی تھی

خوش قسمتی سے مجھے اس کا موقع ملا۔ لیکن جب میں اپریل ۸۳ء میں اورنگ آباد پہنچی تو میری بدقسمتی سمجھئے کہ وحید صاحب بے حد علیل بلکہ فریش تھے۔ ان کی حالت بڑی نازک تھی۔ وہ بات بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ ان کی زندگی کے آخری ایام تھے۔ میں نے وحید صاحب کی برجستہ گوئی، بذلہ سنجی اور خوش طبعی کے کئی واقعات سن رکھے تھے۔ اب جو دیکھا تو بس خموشی ہی خموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس موقعہ پر اور کیا کرتی وحید صاحب کی اہلیہ اور ان کے بعض رشتہ داروں اور دوست احباب ہی سے گفتگو کر سکی اور جتنا مواد مل سکا لے کر بے حد دلشکستگی اور مایوسی کے عالم میں واپس لوٹی۔

وحید خطوط لکھنے میں بے نیاز تھے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جن کی وحید سے خط و کتابت تھی۔ لیکن ان کے خطوط اپنی شگفتگی اور شائستگی میں انشا پردازی کے شہ پارے ہیں۔ محترم عابد علی خاں صاحب مدیر روزنامہ سیاست اور جناب مریم بلگرامی صاحبہ کی بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے اپنے موسومہ وحید صاحب کے خطوط کے نقول سے مجھے نوازا۔

مواد کی فراہمی کے سلسلے میں پروفیسر ہاشم علی صاحب پروفیسر منشی تبسم صاحب، پروفیسر رفیعہ سلطانہ صاحبہ کی سپاس گذار ہوں جنہوں نے اپنے معلومات سے مستفیض ہونے کا موقع دیا۔ مرحوم جناب محامد علی عباسی (آئی۔اے۔ایس) جناب وقار خلیل صاحب کامریڈ کلیم اللہ صدیقی صاحب، پروفیسر انور معظم صاحب محترمہ جیلانی بانو کی بھی تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ اور ساتھ ہی اورنگ آباد کے ڈاکٹر منظر محی الدین، ڈاکٹر صفی الدین صدیقی جناب اختر الزماں ناصر، ڈاکٹر عصمت جاوید کی ممنون ہوں جنہوں نے اپنے گراں قدر معلومات سے مستفیض کیا۔ محترمہ زبیدہ خاتون اہلیہ وحید کی بھی سپاس گذار ہوں جنہوں نے اپنی ذاتی پریشانیوں کے باوجود ہسپتال ہی میں ایک اچھا خاصا انٹرویو دیا۔ وحید کے برادرزادے جناب اشرف علی صاحب کی بھی شکر گذار ہوں جنہوں نے وحید کے حالات زندگی سے متعلق معلومات بہم پہنچائے۔

یوں تو یہ مقالہ ۱۹۸۳ء ہی میں یونیورسٹی میں پیش کیا گیا تھا اور جون ۱۹۸۴ء میں مجھے ایم۔فل کی ڈگری بھی ایوارڈ ہو گئی لیکن دیگر تعلیمی مشاغل و مصروفیات کی وجہ سے ۸۵ء تک

میں نے اس مقالہ کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اسی اثناء
میں مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی نے ۱۹۸۶ء میں کتاب نما کا خصوصی
نمبر "وحید شاعر و شخص" مرتب کیا تھا۔ اب مجھے بھی اس مقالہ
کی اشاعت کا خیال آیا چنانچہ ضروری ترمیم و اضافے کے بعد
میں نے اسے کتابی شکل دیدی ہے۔ پہلے باب میں اس پس منظر کو
پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ جس میں کہ وحید جیسے باکمالوں کی
پرداخت ہوئی ہے۔ دوسرے باب میں وحید کی شخصیت و حیات کا
اسی تہذیبی و ادبی پس منظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں
وحید کی نظم نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھے باب میں شاعر کے
غزلیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اور پانچویں باب میں مجموعی طور پر
ان کی شاعری کو ملحوظ رکھ کر ممکنہ حد تک غیر جانب داری اور ادبی
دیانتداری کے ساتھ مقالہ کی تسوید کی گئی ہے۔

اب جو دیکھا تو اشاعت کا مسئلہ درپیش تھا۔ جو میرے
بس کا نظر نہیں آرہا تھا۔ میں ان دنوں ڈگری کالج راجکوٹی میں بحیثیت
جزوقتی لکچرار کام کررہی تھی۔ یہاں کے حالات کتاب کی اشاعت
کے لئے سازگار ثابت نہ ہوسکے۔ ایسے میں مجھے اپنے ہائی اسکول

سکھ بندگی استاد محترم عبدالرؤف صاحب کی وہ پُر کیف نصیحت
یاد آگئی!

" حوصلے پست نہ ہوں ولولے پژمردہ نہ ہوں
وقت کے سانچے میں ڈھل کر ہی نکھرتی ہے حیات"

اور آج یہ مقالہ وقت کے سانچے میں ڈھل کر نکھر آیا ہے۔
جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سپاس و شکر گذاری کا رواج
ایک فرسودہ روایت ہے۔ لیکن ہندوستان نے اپنی تہذیبی
ورثہ میں روایات کو بڑی اہمیت دی ہے۔ بحیثیت ہندوستانی
اس ورثہ کے رکھوالے ہیں یعنی روایات کی پاسداری ضروری
ہو جاتی ہے۔ اور میں سپاس گذاری کی روایت کو یوں بھی نہیں چھوڑنا
چاہوں گی لہٰذا میں سب سے پہلے محترم استاد پروفیسر سلیمان اطہر جاوید
صاحب کی سپاس گذار ہوں۔ جنہوں نے مجھے ایم۔ فل میں داخلے
سے پہلے ہی شعور تحقیق سے روشناس کرایا اور ایم فل کے دوران
تو شاید انہوں نے نگرانی کا دردِ سر قبول کر کے اور بھی سرفراز کیا
اگر ان کی حوصلہ افزائیاں شامل حال نہ ہوتیں تو آگے بڑھنا محال تھا۔
ساتھیوں میں جناب ڈاکٹر رفعت النسا کی بھی مشکور رہوں

جن کا تعاون مجھے ہر حال میں ملتا رہا ۔ اور ڈاکٹر سید عبدالستار صاحب
کی بھی ممنون خاص ہوں جنکا تعاون نہ صرف تسوید مقالہ تک قائم رہا
بلکہ اس مقالہ کی اشاعت کی قریب قریب تمام ذمہ داریوں کو
اپنے سر لے کر میرے دیرینہ خواب کو شرمندہ تعبیر کیا ۔
کاتب جناب ابو رضوان صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی
ضروری ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود اس
مقالہ کی کتابت میں لگن اور حسیتی کا مظاہرہ کیا ۔ جناب میر مشتاق علی
مالک نیشنل فائین پرنٹنگ پریس کی بھی شکر گذار ہوں کہ انھوں نے
اس کتاب کی طباعت واشاعت میں خصوصی دلچسپی لی ۔ اب
میں اپنے محترم ماموں جان عبدالغفور خاں صاحب کی بھی
سپاس گذار ہوں جن کے فیض تربیت نے نہ صرف مجھ ناچیز کو
زیور علم سے آراستہ کیا ۔ بلکہ اس مقالہ کی طباعت کے سلسلے
میں بھی میری اعانت فرمائی ۔

اختر جہاں

پیش گفتار

سکندر علی وجد جامعہ عثمانیہ کے نامور فرزند اور اردو کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ ان کے ہاں وہ نعرہ بازی، گونج گرج، زندگی کے تعلق سے مرنے مٹنے کا جذبہ، چھیننے جھپٹنے کی باتیں، اور وہ ہما ہمی نہ ملتی ہو لیکن بہر کیف زندگی کو انہوں نے اپنی آنکھ اور اپنے زاویہ سے دیکھا ضرور ہے۔ اور شاعری میں اپنے جذبات واحساسات کی ترجمانی کی ہے ہندوستان کی ثقافت، ہمارے تہذیبی ورثہ ہمارے کلچر اور تمدن کی باقیات کی علامتوں اقدار اور نشانات کو انہوں نے بھرپور انداز میں اپنے کلام میں اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ کچھ یہ بھی وجہ تھی کہ وہ عدلیہ کے ایک اعلی عہدے پر فائز رہے اور پھر کچھ ان کا مزاج کہ سیاسی اور ادبی گروہ بندیوں سے خود کو دور رکھا۔ نہ کسی سیاسی جماعت میں شریک ہوئے نہ کسی ادبی انجمن سے ایسا واسطہ رکھا۔ اپنی سرکاری ذمہ داریوں کو بہ حسن وخوبی پورا کیا اور شعر وشاعری کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔

وحید طالب علمی کے زمانے سے شعر کہتے تھے۔ اور جامعہ عثمانیہ کے دورِ اولین (جس کو جامعہ کا عہدِ زرین بھی کہنا چاہیئے) کے مقبول شاعروں میں رہے۔ جس میں ان کے ترنم کا بھی حصہ تھا۔ اور یہ مقبولیت ان کے آخر دم تک برقرار رہی۔ راست وچپ سے دور اپنی دھن میں انہوں نے شعر گوئی کی۔ ان کے کئی شعری مجموعے "ہوترنگ" "اوراقِ مصور" "بیاضِ مریم" وغیرہ شائع ہو چکے ہیں اور اب "جمال اجنتا" "جلال ہمالہ" ۔۔۔ ادبی گروہ بندیوں سے دور رہنے کی وجہ سے وحید کو جو بھی فائدے ہوئے ہوں یہ نقصان ضرور ہوا کہ اردو تنقید نے ان کی سمت کم توجہ کی۔ اس میں ان کی خودپسندی اور شہرت گریز مزاج کو بھی دخل رہا۔ غرض ان کی شخصیت اور فن پر بہت کم بلکہ برائے نام لکھا گیا۔

عرصہ سے خواہش تھی کہ وحید پر لکھا جائے لیکن کوئی موقع نہ ہوا۔ اور جب چند سال قبل ام۔ اے کا نتیجہ نکلنے کے بعد اختر جہاں نے ام فل کی خواہش ظاہر کی اور وحید کی شخصیت اور شاعری سے ایک گونہ دلچسپی کا اظہار کیا تو میں نے ریسرچ کے لئے ان کی نگرانی کی ذمہ داری بغیر کسی تکلف کے قبول کرلی۔

اختر جہاں کو شعر و ادب اور لکھنے لکھانے سے ابتداء سے

شغف ہے۔ یہی شغف انھیں ایم۔اے اور ایم۔فل (اردو) کی سمت کشاں کشاں لے آیا۔ اپنے مقالہ کے لئے انہوں نے بہت زیادہ محنت کی۔ ستروپتی، پیارہ کر وحید کے جاننے والوں، احباب، پرستاروں اور اردو شعر و ادب پر نظر رکھنے والوں سے مراسلت کے ذریعہ رابطہ پیدا کیا۔ ادبی جرائد کے پرانے فائلوں کی ورق گردانی کی اور خاطر خواہ مواد یکجا کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ یہی نہیں انہوں نے تین چار مرتبہ حیدرآباد کے چکر لگائے اور وحید کے لئے اورنگ آباد کا سفر بھی کیا۔ وحید کو دیکھیں لیکن ان سے تبادلہ خیال کرنے کا موقع نہ ملا کہ ان کی شمع زندگی گل ہونے والی تھی۔ وہ فریش تھے اور ان سے ملنے ملانے پر پابندی تھی۔ بہرکیف جس قدر کہ ایک ریسرچ اسکالر کے حیطۂ امکان میں ہوتا ہے اختر جہاں نے کوشش کی اور وحید کی حیات اور شخصیت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کیں۔ ان کے شعری مجموعے حاصل کیے اور وحید کے خطوط تک بھی ان کی رسائی ہوئی اس سارے جہاں کی چھان پھٹک کے بعد اس کو نہایت سلیقہ سے پیش کیا۔ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اختر جہاں نے معروضی نقطہ نظر اختیار کیا ہے اور وحید کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا تمکنہ

گہرائی کے ساتھ محاسبہ کیا ہے۔ وحید کو غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی ان کی غزلوں کے جہاں کئی اشعار زباں زدِ خاص و عام ہیں۔ ان کی نظموں کے کئی اشعار بھی لوگوں کو ازبر ہیں۔ اختر جہاں نے غزل اور نظم کے لئے علحدہ علحدہ ابواب قائم کرتے ہوئے سیر حاصل جائزہ لیا ہے۔ اور آخر میں دیگر شاعروں کے کلام سے وحید کی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے اردو شاعری میں وحید کی اہمیت واضح کی ہے۔ کتابی صورت میں پیش کرتے ہوئے مقالہ میں مناسب اور ضروری ترمیم اور حذف و اضافہ سے کام لیا گیا ہے زبان و بیان پر بھی نظر ثانی کی گئی ہے اور ترتیب بھی تھوڑی بہت اِدھر اُدھر ہوئی ہے۔ اسطرح ام۔ فل کا یہ مقالہ کتابی صورت اختیار کرتے ہوئے خاصا چست اور متوازن ہو گیا ہے۔ وحید پر "کتاب نما" کے خصوصی شمارے سے قطع نظر، جو اس مقالہ کی تسوید کے کہیں بعد شائع ہوا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اختر جہاں کی یہ کتاب وحید پر پہلا مطبوعہ اور اہم کام ہے۔ مجھے یقین ہے اردو شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے عموماً اور وحید کی شخصیت اور شاعری کے پارکھ اور پرستار خصوصاً اس کتاب کا خیر مقدم کریں گے۔

اس کتاب میں یہاں وہاں کمی محسوس کیجا سکتی ہے جس کا باعث وہ سہولتیں ہیں جو اختر جہاں کو بوجوہ حاصل نہ ہو سکیں۔ مجھے توقع ہے اختر جہاں تحریر و تصنیف کا کام جاری رکھیں گی اور اپنی صلاحیتوں سے نئے لکھنے والوں میں اپنا مقام بنائیں گی۔

۱۳ اپریل ۱۹۹۰ء
شعبۂ اردو
ایس۔ وی۔ یونیورسٹی۔
تروپتی (آندھرا پردیش)

سلیمان اطہر جاوید

بیسویں صدی کا آغاز بین الاقوامی طور پر تہذیبی ادبی اور
سیاسی زندگی میں کئی زاویوں سے اہمیت رکھتا ہے۔ چین میں بغاوت
شروع ہو چکی تھی، ترکی انقلابی حالات سے دوچار تھا۔ ۱۹۱۷ء میں
روس میں عوامی حکومت تشکیل دی جا چکی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں امریکہ
نے بھی اپنی آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ ایران بھی اپنے خواب گراں سے
بیدار ہو رہا تھا۔ جاپان نے روس جیسی عظیم طاقت کو نیچا دکھا کر
یورپی ممالک کی برتری کے گھمنڈ کو پارہ پارہ کر دیا تھا، خود ہندوستان
میں بھی ایسا تاثر برطانوی سامراج کے خلاف جوش و جذبات
میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اور قومی آزادی کی جدوجہد تیز سے تیز تر
ہوتی جا رہی تھی، بیسویں صدی جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے،
ہندوستان کا معاشرتی اور سیاسی نقشہ بھی تبدیل ہونے لگتا ہے
پہلی جنگِ عظیم کا اندوہناک سانحہ اور حالی و شبلی جیسے ادبی رہنماؤں کی

وفات کے المناک حادثے ۱۹۱۲ء ہی میں رونما ہوتے ہیں، جس سن میں کہ سکندر علی وجد کی پیدائش عمل میں آئی ؎

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
(اقبال)

انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ انیسویں صدی میں ہی علی گڑھ کالج کی تاسیس بھی پڑ چکی تھی، لیکن بیسویں صدی کی ابتدا تک وہ انگریزوں کا آلۂ کار تھی! اس کے سربراہ نواب وقار الملک کو انگریزوں کی بدخواہی کا بخوبی علم تھا لہٰذا انھوں نے ۱۹۱۱ء میں لکھنؤ میں ایک انجمن کا افتتاح کیا جو محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن کے نام سے موسوم ہوئی۔ اب ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی شعور نے ایک نئی کروٹ لی۔ اس انجمن کا مقصد مسلمانوں کی رہنمائی کرنا اور انکے دل و دماغ کو ان غلط فہمیوں سے صاف کرنا تھا۔ جو علی گڑھ کالج کی بدخواہی کے زیرِ اثر دلائی تھیں۔ مسلمانوں میں ایک غلط خیال عام تھا کہ برطانوی حکومت کی فرماں برداری ہی میں ان کا مفاد مضمر ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہماری آزادی میں

رقمطراز ہیں۔

"مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی اس وقت علی گڑھ
پارٹی کے ہاتھ میں تھی، اس کے رکن اپنے آپکو
سرسید کی پالیسی کا امین سمجھتے تھے۔ ان کا بنیادی
عقیدہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو برطانوی تاج کا وفادار
اور قومی تحریک سے الگ اور بے تعلق رہنا چاہیئے"۔[1]

مسٹر آرچ بولڈ پرنسپل علی گڑھ کالج نے مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے مصلحت سے کام لینا چاہا حکومت اور مسلمانوں کے درمیان مصالحت اور مفاہمت کی راہ ہموار کی جس کا نتیجہ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس دوران نواب وقارالملک اور پرنسپل آرچ بولڈ کے درمیان کشیدگی بڑھتی گئی۔ بالآخر وقارالملک نے ۱۹۱۰ء میں قومی مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلم لیگ کے دفتر کو علی گڑھ سے لکھنؤ منتقل کر دیا اور پرنسپل آرچ بولڈ کو اتنا مجبور کیا کہ ان کو مستعفی ہونا پڑا۔ اب مسلم لیگ خالص سیاسی مسائل سے متعلق ہو گئی۔ کئی مسائل پر اس نے

---

[1] ابوالکلام آزاد (مترجم محمد مجیب)، "ہماری آزادی" اورینٹ لانگ مینس بمبئی پہلی اشاعت

سے کانگریس کی حمایت بھی کی تاکہ آگے چل کر ہندو مسلم اتحاد کیلئے راہ ہموار ہو۔

مولانا آزاد نے قومی آزادی کی تحریک کو پیش نظر رکھتے ہوئے جون ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کیا جسکی اشاعت سے اردو صحافت میں ایک انقلاب آیا۔ اسکی مقبولیت کو دیکھ کر حکومت کو بڑی پریشانی ہوئی' اخبار سے کئی بار ضمانتوں کا مطالبہ کیا جو بہت جلد ضبط کرلیا جاتا اسکے علاوہ ۱۹۱۵ء میں پریس ایکٹ کے تحت "الہلال" پریس کو بھی ضبط کرلیا گیا حکومت کی ستم ظریفی کو نظر انداز کرتے ہوئے مولانا آزاد نے ایک دوسرا اخبار "البلاغ" جاری کیا اس پرچے کی بدولت انھیں عوام کے جوش و خروش کو ابھارنے میں کما حقہٗ مدد ملی۔

سنہ ۱۹۱۴ء بین الاقوامی طور پر ابھر کر آیا تھی مسائل کی فراوانی کی وجہ سے برطانوی حکومت کو اب ہندوستانیوں کو سمجھنے اور انکے مسائل سلجھانے کا موقع ہی نہیں رہا۔ وقتی طور پر انھیں خاموش کرنے کیلئے جھوٹے وعدوں سے کام لیا گیا' سبز باغ دکھائے گئے لیکن ہندوستانیوں کے جذبات کو خاموش نہیں کیا جاسکا

سال ۱۹۱۶ء کے آتے آتے ہوم رول کی صدا ہندوستان کے گوشے گوشے سے آنے لگی جسکا اثر شعراء نے بھی قبول کیا۔ چکبست کی کئی منظومات میں وطن کی عظمت، انقلاب، ہند اور ملک کے ناسازگار حالات کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ "وطن کا راگ" "آوازۂ قوم" "اور ہم ہوں گے عیش ہوگا ہوم رول ہوگا" اسی زمانے کی تخلیقات ہیں جن میں اس دور کے حالات کی عکاسی ملتی ہے۔

حکومت انگلستان نے ہندوستانیوں سے جو وعدے کئے تھے وہ کبھی پورے کرنے کیلئے نہیں کئے تھے۔ جنگ کے اختتام پر اس نے خلاف وعدہ نہ صرف ہندوستانیوں کو سیاسی حقوق سے بے دخل کیا بلکہ "رولٹ ایکٹ" کے تحت غلامی کی زنجیروں کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ ؎

روز و شب سلسلۂ حادثہ پیمائی ہے
وقت حالات کا خاموش تماشائی ہے (وحید)

نوابانِ حیدرآباد کو برطانوی حکومت سے کسی قسم کا اندیشہ نہ تھا اور نہ ان کے درمیان کسی قسم کی کشیدگی تھی اسکے باوجود جو عظیم انقلاب وہاں پر اردو ذریعۂ تعلیم کی صورت میں رونما ہوا۔

اس سے خود حکومت نا واقف تھی۔ یہ ایک طمانچہ تھا بدیسی ذریعۂ تعلیم پر جب ۱۹۱۱ء میں سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان آصف جاہ سابع تخت نشین ہوئے تو انہیں ریاست کے انتظام اور اس کی فلاح و بہبود کے بہترین مواقع میسر آئے۔ موصوف کے عہد میں شہر کے انتظام اور اسکی تہذیب میں ایک جدت پیدا ہوئی، اور یہ جدت اور ندرت نہ صرف شہر کی انتظامی کیفیت تک محدود رہی بلکہ عوام کے ذہنی تصورات اور رجحانات تک بھی رسائی حاصل کر چکی تھی بقول ڈاکٹر زور۔

> خود شہر کی سڑکوں اور عمارتوں کے ساتھ ساتھ اس میں رہنے والوں کے خیالات اور رجحانات میں بھی تبدیلی شروع ہو چکی تھی اور یہ شہر جدید تہذیب اور روشنی کا مرکز بننے لگا۔ [1]

عوام میں ابھی آزادی یا غلامی کا کوئی صحیح شعور نہیں تھا۔ ان کے پیشِ نظر علی گڑھ کی تعمیری حیثیت ہی نمایاں نظر آ رہی تھی۔ یوں بھی

[1] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ "داستان ادب حیدرآباد" ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد پہلی اشاعت ۱۹۵۱ء ص ۱۷

آصف جاہ سابع کا عہد حیدرآباد میں شعر و ادب کے فروغ کا
بہترین عہد تھا اسی دور میں کئی انجمنیں مثلاً "ایجوکیشنل کانفرنس"
"انجمن ترقی اردو" اور "انجمن ارباب اردو" وغیرہ قائم ہوئی تھیں۔
وحید کے اشعار ہیں؛ ؎

قدرت نے جس کو علم و فضل و ہنر دیا تھا
جوشِ عمل دیا تھا ذوقِ نظر دیا تھا

حیران تھا زمانہ وہ کروفر دیا تھا
فطرت نے جسکی شب کو نورِ سحر دیا تھا

یہ ہے دکن ہمارا پیارا وطن ہمارا (ترانۂ دکن)

آصف جاہ چہارم کے جانشین مختار الملک کے عہد ہی سے حیدرآباد میں
اردو یونیورسٹی کیلئے راہ ہموار ہو رہی تھی اسکے باوجود یونیورسٹی کا قیام
عمل میں نہیں آیا تھا سے ۱۸۷ء میں نظام کالج کا قیام عمل میں آیا۔
جو مدراس یونیورسٹی سے ملحق تھا مصارفِ کثیر کے باوجود یہاں
سے اطمینان بخش نتائج برآمد نہیں ہو سکے ۱۹۰۱ء میں بی اے میں
صرف تین طلباء کی کامیابی بظاہر زوال علم کی غماز تھی۔ جبکہ دارالعلوم
جہاں مولوی فاضل تک تعلیمی سہولتیں فراہم تھیں۔ دن دونی رات چوگنی

ترقی کرنے لگا جسکی وجہ سے عوام ایک ایسی یونیورسٹی کا خوشگوار خواب دیکھنے لگے جس کا ذریعۂ تعلیم انگریزی کی بجائے اردو ہو۔ ۱۹۱۴ء میں ایجوکیشنل سوسائٹی قائم ہوئی جسکے بنیادی مقاصد میں جامعۂ نظام کا قیام بھی شامل تھا۔ جسکا ذریعۂ تعلیم اردو ہو۔

یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو جب ہوم سکریٹری سر اکبر حیدری کی صدارت میں ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا تو انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں اس بات کی پیشن گوئی کی۔

"خدا نے چاہا تو چند سال میں دارالعلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو جائے گا جسکی نظیر ہندوستان بھر میں نہ ہوگی اور جس کا فیض دور دور تک پہنچے گا اور لوگ ملک ملک سے اس سے مستفید ہونے کے لئے آئیں گے اور حیدرآباد مرکز علم وفنون بن جائے گا۔" [1]

اس پیشن گوئی کے ساتھ ہی انہوں نے جامعہ کے قیام کیلئے سرکاری طور پر فضا بھی ہموار کی اور ۱۹۱۷ء میں ایک عرضداشت بنام سلطان العلوم

[1] ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، داستان ادب حیدرآباد "ادارۂ ادبیات اردو" حیدرآباد۔ اشاعت اول ۱۹۵۱ء ص۱۸۶۔

میر عثمان علی خان آصف سابع تحریر کی گئی جس میں اس عہد کے رہنماؤں اور خیر خواہوں کی خواہش کے مطابق اپنی نوعیت کی ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام کی طرف متوجہ کیا گیا جسکا ذریعۂ تعلیم عام جامعات سے ہٹ کر اردو ہو، اور انگریزی کو دوسری لازمی زبان کی حیثیت دی جائے۔

آصف سابع نے اس عرضداشت کو وقت کا تقاضا سمجھکر بخوشی منظور فرمایا۔ اور ۲۶ اپریل ۱۹۱۷ء کو ایک فرمان صادر کیا جسکی رو سے جامعہ عثمانیہ کے قیام کی اجازت دی گئی اور ساتھ ہی ان مسائل کے حل کیلئے تجاویز بھی شامل کی گئیں۔ جو جامعہ کے قیام کے بعد رونما ہو سکتے تھے۔

اس فرمان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سب سے پہلے جو مسئلہ درپیش تھا وہ اردو زبان و ادب میں اعلیٰ درجہ کی معیاری کتابوں کی تیاری کا تھا۔ جس کو حاصل کرنے کیلئے ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو سررشتۂ تالیف و ترجمہ Bureau of Compilations Translations کا قیام عمل میں لایا گیا جو دارالترجمہ کے نام سے معروف ہوا۔ جس میں معیاری ادبی و غیر ادبی نصابی کتابوں کا اردو میں

ترجمہ کیا جاسکے گا۔ اور کئی علمی اصطلاحات جو یورپ کی جدید زبانوں میں لاطینی اور یونانی سے لی گئی تھیں۔ ان کو زبان کے مزاج سے ہم آہنگ کیا گیا جنکی تعداد پچپن ہزار سے بھی زاید ہے اس کار خوش آئند کو انجام دینے کیلئے ملک کے تجربہ کار علماء لائق ادباء و شعراء کو مدعو کیا گیا۔ جن میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مرزا ہادی رسوا، قاضی تلمذ حسین، مولانا عبداللہ عمادی، محمد الیاس برنی، سید سعید ہاشمی فریدآبادی، اور جوش ملیح آبادی جیسے مایہ ناز ارباب علم شامل تھے۔ ان صاحبان نے اپنے فرائض بہ حسن و خوبی انجام دیئے۔ تاآنکہ پولیس ایکشن کے بعد بانی جامعہ میر عثمان علی خان کو ریاست حیدرآباد کی حکمرانی سے سبکدوش ہونا پڑا۔ اسکے بعد دارالترجمہ کی سرگرمیوں پر بھی ایک طرح کا جمود طاری ہوگیا سنہ ۱۹۵۰ء میں جب جامعہ کا ذریعہ تعلیم اردو کی بجائے انگریزی قرار دیا گیا تو اس دارالترجمہ کی کچھ ایسی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ چنانچہ ترجمہ و اشاعت کا کام بھی روک دیا گیا اسکے باوجود ۸ار اگست ۱۹۵۵ء کی شب، اس اگنج گراں مایہ کیلئے رستخیز بے جا ثابت ہوئی جبکہ بعض بدنہادوں نے سازش کرکے اس عظیم ادارے کی عمارت میں (مبینہ طور پر) آگ لگادی

اور نایاب و کمیاب تخمیناً اسی ہزار سے ایک لاکھ کی مالیت کی تصانیف و تالیفات نذرِ آتش ہوگئیں۔

دارالترجمہ کے قیام کے بعد ۲۲ ر ستمبر ۱۹۱۸ء کو منشور خسروی کی رو سے جامعہ کا باقاعدہ قیام عمل میں آیا اور اس کا دستور و ذیلی قواعد بھی بنائے گئے۔ یکم ذالحجہ ۱۳۳۷ھ مطابق شمسی ۲۸ ر اگست ۱۹۱۹ء کو بروز پنجشنبہ جامعہ عثمانیہ کی افتتاحی تقریب آغا منزل میں منعقد ہوئی۔

یہی وہ زمانہ ہے جبکہ مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد صمد رضوی ساز، اور تمکین جیسے شعرائے جامعہ کی ادبی و شاعرانہ مرتبت کو بڑھانے میں اہم حصہ لیا۔ یہ دور حیدرآباد میں اردو کے عروج و اقبال کا دور تھا۔ خصوصاً شعراء کیلئے تو مناسب ترین عہد تصور کیا جاتا ہے۔ وجد نے بھی اپنے اشعار میں اس دور کی یادوں سے چراغاں کا سا سماں پیدا کر دیا ہے۔ ؎

رہ زندگی میں جو گزرے غم لٹیواں
ان آوارہ لمحوں کو جی ڈھونڈتا ہے!

شہر کے ہر گوشے میں شعر و شاعری، بیت بازی، مشاعرے

اور مناظرے ہوا کرتے تھے۔ کوئی تقریب ایسی نہیں ہوتی تھی جہاں غزل سرائی کی رسم ادا نہ ہوتی ہو۔ حیدرآباد کے ادب و آداب میں غزل اور متغزلین کو وہ مقام حاصل تھا جو شاید ہی کسی اور کو حاصل رہا ہو، نہ صرف جوان بلکہ معمر بھی شعر و شاعری کے میدان میں نت نئے گل بوٹوں کی گلکاری کرتے اور وہ راگ الاپتے تھے کہ سب دم بخود ہو جائیں۔ یہی وہ پس منظر ہے جو اس دور کے مزاج کو مترشح کرنے کیلئے کافی ہے۔ مشاعرے ہر چند ہوتے ہی رہتے تھے۔ درسگاہوں کے ان مشاعروں کا بھی رواج تھا جن میں معمر اساتذہ اور نوخیز طلباء ایک ساتھ اپنے اپنے کلام سے اہل محفل کو محظوظ ہونے کا موقع فراہم کرتے۔ اور ان گھریلو مشاعروں کا بھی چرچا تھا۔ جو پر تکلف طعام و بے تکلف محفل ساغر و جام کے بعد مہمانوں کی سامعہ نوازی کیلئے منعقد ہوا کرتے تھے اسطرح کی نشست میں بلا امتیاز مہمان و میزبان سب اپنا اپنا کلام پیش کرتے و نیز ریڈیائی مشاعروں کا بھی رواج ہونے لگا تھا۔ جن میں شعراء اپنا کلام ریڈیو کے ذریعہ ملک کے تمام افراد تک پہنچایا کرتے تھے۔ اور عام مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ اس زمانے کا حیدرآباد انیسویں صدی کی دہلی اور

اور لکھنؤ کی مرپرتکلف یاد کو تازہ کرتا ہے۔ وہی سخن پرور ماحول وہی طور طریقہ وہی ادب و آداب رکھ رکھاؤ اسی طرز کی محفلیں اور مشاعرے غرض ہر چیز میں دہلوی اور لکھنوی تہذیب کا ایک شگفتہ اور شستہ عکس نظر آتا تھا یہاں بھی نظم کی بنسبت غزل کی پذیرائی زیادہ تھی۔ ہر شاعر کیلئے غزل گوئی گویا ضروری تھی۔ لیکن زبان پر مقامی بول چال کی وہ چھاپ نظر نہیں آتی تھی۔ جو قلی قطب شاہ اور اسکے بعد کے دکنی شعرا کے کلام میں نمایاں تھی۔ وجد نے اس صورت حال کو یوں قلمبند کیا ہے

یہی شہری غزالوں کا وطن ہے ۔۔ نیستانِ غزل ارضِ دکن ہے

دریں اثناء ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم نے جامعہ عثمانیہ کے ہونہار طلباء کی علمیت و قابلیت کو نکھارنے کے لئے ۲۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو ادارۂ ادبیات اردو کی بنا ڈالی جہاں دکن کے قدیم اردو شعراء کے غیر مطبوعہ کلام اور ادباء کی تخلیقات کو زیور طبع سے آراستہ کیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ اس ادارے سے کئی طلباء کی تخلیقات بھی شائع ہوئیں۔ اور ۱۹۳۸ء کے شروع ہی سے ماہنامہ "سب رس" کا اجرا ہوا۔ اس طرح حیدرآباد کے نوعمر ادیبوں اور شاعروں کو طبع و اشاعت کی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں۔ خود جامعہ عثمانیہ

سے ایک سہ ماہی رسالہ مجلہ عثمانیہ ۱۹۲۷ء میں جاری ہو چکا تھا
یہ مجلہ بھی طلباء کو مستطیع کرنے میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ اس مجلہ
میں اردو اور انگریزی کیلئے دو حصے مختص تھے اور دونوں حصوں
کے مدیر کا انتخاب طلباء کی رائے دہی سے ہوتا تھا۔ جس میں اسکی
ادبی استطاعت کو بھی ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ جسکی نگرانی دو پروفیسروں
کے ذمہ ہوتی تھی۔ جامعہ کے فیض یافتگان کو اب اپنے اطراف و
اکناف کا بھی شعور حاصل ہو چکا تھا۔

ریاست حیدرآباد کے عوام اب ہندوستان کی قومی تحریکوں
سے نابلد نہیں تھے۔ جلیان والا باغ کا واقعہ، تمک ستیہ گرہ اور
اسی طرح کی کئی چیزوں نے انہیں کافی متاثر کیا تھا۔ اب انہیں
حرفِ دوئی کی اصلیت کا پتہ بھی چلا۔ اب دکن اور ہندوستان
کے درمیان جو خلیج حائل تھی اسکی نزاکت کا بھی صحیح اندازہ ہو گیا۔
انہوں نے ہندوستان کو غیر یا پڑوسی نہیں بلکہ اپنا سمجھا۔ انہیں
یقین تھا کہ برطانوی عفریت کا ظلم و استبداد آن کی آن میں انہیں
بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۵ء یوں بھی کوئی سیاسی
پارٹی موجود نہیں تھی۔ اسکے باوجود مجلسِ اتحاد المسلمین کے حامیوں کی

ایک کثیر تعداد شہر حیدرآباد میں تھی۔ پوشیدہ طور پر کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آرہا تھا۔ کانگریس پارٹی کے حمایتیوں کی تعداد بھی کافی تھی چنانچہ ریاست حیدرآباد ایک ایسے تہذیبی موڑ پر تھی جنکو ہم سیاسی پیچیدگی سے موسوم کر سکتے ہیں۔ عوام شخصی اور جمہوری حکومتوں کے مابین پائے جانے والے فرق سے نبرد آزما تھے۔ اسی اثناء ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے جو ہندوستان میں نمو پارہی تھی۔ حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی متاثر کیا اور خاص طور پر سکندر علی وجد کے ہم عصر مخدوم محی الدین اس تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ اکثر شعراء نے ہندوستانی تہذیب و تمدن کو اپنے اشعار میں ڈھالنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی برطانوی حکومت کے ہولناک پہلوؤں کو بھی اپنی منظومات میں جگہ دی تاکہ عوام کو برطانوی عفریت کے بڑھتے ہوئے جبر و استبداد کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

ایسے شعراء میں چکبست، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی اور سکندر علی وجد کے نام بطورِ خاص لئے جاسکتے ہیں۔ سکندر علی وجد عالم طالب علمی سے کانگریس سے متاثر تھے۔ دادران کا یہ تعلق

تادمِ حیات رہا) اپنی ابتدائی منظومات اور غزلیات میں جہاں جہاں گنجائش نکل آئی انہوں نے وطن کی آزادی کے گیت گائے۔ اس سلسلہ میں ان کی بعض منظومات اور غزلوں کے بعض اشعار کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ بالخصوص یہ شعر جس کا ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی اپنے ایک مکتوب میں حوالہ دیا ہے ؂

نگاہ اہلِ گلشن کہہ رہی ہے
خزاں جائے بہار آئے نہ آئے

وحید ایک حساس شاعر ہونے کے علاوہ دیدۂ بینا بھی رکھتے تھے انہوں نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنے محسوسات کو عوام کے دل و نظر سے قریب کیا انکی ابتدائی منظومات اپنی رومانی و شبابیاتی کیفیات کے علاوہ موعظت آمیز لہجہ بھی رکھتی ہیں۔ جو سامعین کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا ــــ شاعر کی زبان میں کتنا اثر تھا اس کا فی الوقت شاید اندازہ نہ لگے۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ اس وقت ماحول میں تھوڑی بہت گرمی پیدا ہونی تھی اور ہوئی۔ لہٰذا ہم اس جزوی تبدیلی کا شاعری کو محرک متصور کر سکتے ہیں۔ انہوں نے جو بھی باتیں اپنی منظومات میں پیش کی ہیں وہ سب اس وقت کے تقاضوں کو

مدِ نظر رکھ کر کہی ہیں۔ طالب علم جو بڑی حد تک حساس ہونے کے ساتھ ساتھ جوشیلے بھی ہوتے ہیں۔ وجد نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں آنے والے حوادث سے باخبر کیا۔

۱۹۳۷ء میں جب انہیں عدالتی ٹریننگ کے سلسلے میں سیتاپور (اودھ U.P.) جانے کا موقعہ ملا تو انہوں نے وہاں کی زندگی کو ایک بدلے ہوئے وسیع پس منظر میں دیکھا برطانوی ظلم و ستم جبر و استبداد کے تدارک کے لئے انہوں نے بہت کچھ سوچا اس وقت ہندوستانیوں پر ایک پژمردگی سی چھا گئی تھی پیہم ظلم و ستم سہتے سہتے ان کے حوصلے پست ہوچکے تھے۔ ہمتیں جواب دے چکی تھیں قوتِ ارادی کا تو پہلے ہی سے فقدان تھا۔ مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے سب کے دل بجھ گئے تھے۔ ان واقعات نے وجد کے حساس دل کو چھلنی بنا دیا اور ایک نامعلوم جذبہ حبِ وطنی کا ان کے اشعار سے جھلکنے لگا۔ اب وہ حقیقت بین و حقیقت آگاہ شاعر ہو گئے جسکی نوکِ قلم سے نئی تابندگی کے اشعار جاری تھے۔ شاعر جو ایک عثمانین سے مخاطب تھا اب ریاست حیدرآباد کے عوام سے ہی نہیں

بلکہ ہندوستانیوں سے مخاطب ہوا۔

یہی وہ زمانہ ہے جس میں کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی جنگ عظیم کے اختتام پر برطانوی وزیراعظم مسٹر چرچل اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور ان کی جگہ لیبر پارٹی کے مسٹر اٹیلی وزیراعظم مقرر ہوئے۔ لیبر پارٹی کو اہل ہند کی آزادی اور ان کے سیاسی حقوق کے تحفظ سے دلچسپی تھی۔ لہٰذا ۱۹۴۶ء میں ہندوستان میں ایک عارضی مخلوط حکومت قائم کی گئی۔ جسکے وزیراعظم جواہرلال نہرو اور وزیر مالیات مسلم لیگ کے نمائندے مسٹر لیاقت علی خاں مقرر ہوئے۔

لیکن یہ تجربہ عملی طور پر ناکام رہا جسکی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد خطرے میں پڑ گیا۔ جب یہ شگوفہ کھلا تو وجد کو بڑا دکھ ہوا اور انہوں نے نظم "اندیشے" لکھی۔ مخلوط حکومت کا یہ منصوبہ آزادی کا حل تو نہیں بن سکا۔ اس کے برعکس آزادی کی کرن اور مدھم ہوتی نظر آنے لگی۔

اتحاد کسی بھی صورت میں ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔ چنانچہ جون ۱۹۴۷ء کو قانون آزادی ہند منظور ہوا جسکی رو سے طے پایا کہ ملک کی تقسیم عمل میں آئے گی اور پاکستان تشکیل دیا جائے گا۔ دیسی ریاستوں پر سے برطانوی حکومت کی بالادستی اٹھ جائے گی۔

اور وہ خود مختار ہو جائیں گے اور انہیں یہ حق حاصل رہے گا کہ وہ جس ملک کے ساتھ چاہیں اپنے دستوری تعلقات استوار کر سکیں۔

قانون آزادیٔ ہند کو روبہ عمل لانے کیلئے حکومت برطانیہ نے لارڈ مونٹ بیٹن کو ہندوستان بھیجا اور حالات نے کچھ ایسی تبدیلی لی کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوگیا۔ جسکے پہلے وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن اور وزیر اعظم جواہر لال نہرو مقرر ہوئے آزادی کے آفتاب کے طلوع ہونے کے بعد وحید کی مسرور نظروں کو ہر طرف مسرت ہی مسرت نظر آنے لگی۔ اس خوشگوار منظر کو دیکھنے کے بعد اسی خوشی و سرمستی کو انہوں نے اپنی نظم "آفتاب تازہ" میں مقید کر لیا۔ نظم "بشارت" میں انہوں نے جس کل" کی بشارت دی تھی وہ کل" آج آچکا تھا۔ ؎

اک دلنواز خواب حقیقت میں ڈھل گیا

نخلِ امید اہل نظر بار ور ہے آج !!

محسوس ہو رہا ہے انوکھا سہانا پن

اک سادہ جھونپڑا ہی سہی اپنا گھر ہے آج

ویسے بعض شعرا ایسے بھی تھے جنھیں یوم آزادی حقیقت آمیز نظر نہیں آرہا تھا۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جسکا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جسکی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائیگی کہیں نہ کہیں (فیض احمد فیض)

یہاں فیض کی اشتراکیت پسندی اور وجد کی کانگریسی آئیڈیالوجی کو ملحوظ رکھا جاسکتا ہے۔ بقول اشفاق حسین "وجد سخت گاندھی وادی ہیں۔ ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۶ء تک کٹر کانگریسی رہ چکے ہیں"۔ [1]

وجد حسن سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ یوم آزادی کی رنگینیوں نے بھی انھیں جلد اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ لیکن یہ رنگینی تو بس لمحاتی رہی جلد منتشر ہوگئی۔ فرقہ وارانہ فساد جسکو ہم بس ایک دو نظروں میں پڑھ لیتے ہیں اسکا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ایسے بھیانک واقعات رونما ہو رہے تھے جو انسانیت کی روح کو مجروح کرنے کیلئے کافی تھے۔

---

[1] سوونیر جشن وجد اورنگ آباد۔ دسمبر ۱۹۸۲ء اشفاق حسین "بیاضِ مریم"۔

گاندھی جی ملک کی تقسیم کے سلسلے میں کبھی مطمئن نہیں تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات نے ان کے ٹوٹے دل پر اور بھی ستم ڈھائے اور اسکو پارہ پارہ کردیا۔ پنجاب، سندھ، بنگال، صوبہ سرحد کے علاقوں میں پناہ گزینوں کے جھنڈ کے جھنڈ بے سروسامانی کے عالم میں ایک مسئلہ بن گئے۔ دونوں ممالک کا لگ بھگ چھ لاکھ کا جانی اور کروڑوں کا مالی نقصان ہوا۔ خون آشامی، قتل و غارت گری کا جو بازار گرم ہوا وہ اس کے پہلے شاید ہی کسی زمانے میں ہوا ہوگا۔ ان واقعات سے ایک شاعر کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ وجد نے ۱۹۴۷ء میں نظم "جمنا کی فریاد" لکھی جو ایک دردبھری سرگزشت ہے۔ ایک سچے ہندوستانی بلکہ خود ہندوستان کے دل کی فریاد ہے۔ قتل و غارت گری کا جو اندوہناک منظر دکھائی دے رہا تھا اسکی تصویر انہوں نے بڑی خوبی سے کھینچی ہے ؎

تباہی کا طوفاں ہے چاروں طرف
ہر اک طفل و پیر و جواں لٹ گیا

آزادیٔ ہند سے پہلے یعنی جولائی ۱۹۴۷ء ہی سے لارڈ مونٹ بیٹن کی یہ کوشش رہی کہ حکومت ہند اور نظام کے تعلقات خوشگوار ہو جائیں اس سلسلے میں موصوف نے اکثر نظام کے آئینی مشیر مونکٹن اور

وزیر اعلیٰ نواب چھتاری سے گفت وشنید کی، باوجود اس کے اگست ۱۹۴۷ء تک کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ آزادی کے بعد بھی نظام کو الحاق کیلئے دو مہینوں کی مزید مہلت دی گئی۔ حیدر آباد میں مجلس اتحاد المسلمین کے سربراہ نواب بہادر یار جنگ اور اکثر ان کے قائدین کو ہندوستان سے حیدر آباد کا الحاق مطلق پسند نہ تھا۔ جس کی وجہ سے نظام سابع کو الحاق کی صورت میں خون آشامی کا اندیشہ نظر آرہا تھا۔ انہیں اس بات کا بھی ڈر تھا کہ حیدر آباد کی خودمختاری مستحکم نہیں رہ سکتی۔ تاہم بسیار کے بعد انہوں نے نومبر ۱۹۴۷ء میں معاہدۂ قائمہ پر دستخط کئے۔ لیکن ایک ماہ گزرتے گزرتے پھر فضا مکدر ہوگئی۔ اور سال نو کے آغاز کے ساتھ ہی ہند و حیدر آباد کے تعلقات میں رخنہ پیدا ہو گیا۔ ہندوستان کے ایجنٹ جنرل کے۔ ایم منشی کے قیام کے سلسلے میں تنازعہ برپا ہوا۔ اس سے بھی زیادہ تشویشناک صورت ریاست حیدر آباد نے پاکستان کو بیس کروڑ روپئے قرض دے کر پیدا کر دی۔ جو معاہدہ قائمہ کے عین خلاف تھا۔ لہٰذا اور بھی کئی جزوی واقعات رونما ہوئے کہ معاہدۂ قائمہ منسوخ ہو گیا۔ ماونٹ بیٹن اور مونکٹن پھر ہاتھ پیر مارنے لگے۔ مگر فضا خوشگوار ہو نہ سکی۔

۱۳ ستمبر کی صبح کو ہندوستان کی طرف سے فوجی کاروائی شروع ہو گئی
اور ۱۷ ستمبر کو ہندوستانی فوج چاروں طرف سے حیدرآباد و سکندرآباد
میں داخل ہو گئی اور پولیس ایکشن کی تباہ کن صورت رونما ہوئی۔ پولیس
ایکشن کے بعد خود وجد کی طبیعت میں ایک تغیر پیدا ہوا خود انکے اپنے الفاظ
میں: "زوال حیدرآباد ۱۹۴۸ء کے بعد میری زندگی
صحت اور شاعری میں بڑی تبدیلی آئی" [۱]
یہی وجہ ہے کہ ان کا وہ سیاسی شعور جو عمر کے ساتھ ہی بڑھتا گیا
تھا۔ اب اس میں ایک ٹھہراؤ سا پیدا ہو گیا۔ اب ان کی توجہ کسی اور طرف
مرکوز تھی جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

"مطالعے کے علاوہ میں ہندوستانی کلاسیکی رقص و
موسیقی کا دلدادہ ہوں" [۲]

جس کے نتیجے میں رقاصہ، طیبہ، پروین سلطانہ، نغمے کی موت
سارنگی جیسی منظومات منظر عام پر آئیں۔ اس کی دوسری وجہ خود ان کی
طبیعت کی ناسازی تھی۔ ایک شکست خوردہ سپاہی کی طرح پولیس
ایکشن کے بعد ان کی صحت دمہ کی موذی مرض سے متاثر ہوئی اور پھر

---

[۱] سکندر علی وجد "میں اور میرا فن" ہفت روزہ بلٹز بمبئی ۱۵ جولائی ۱۹۷۰ء
[۲] ایضاً

اِس یاؤس علالت کا سلسلہ چلتا رہا جس نے کبھی شدت اختیار کی کبھی کمی اور کبھی ایسا بھی محسوس ہوا کہ وحید صحتیاب ہو چکے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی صحت برابر متاثر رہی۔

۱۹۵۶ء میں جب لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیم جدید عمل میں آئی تو وحید اورنگ آباد سے اپنے تعلق کے باعث صوبۂ مہاراشٹرا کے ہو گئے اورنگ آباد کی ادبی فضا جو ولی کے عہد سے ادب پرور رہی۔ وحید کی شاعرانہ صلاحیت کو متور کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ اورنگ آباد کے علاوہ مہاراشٹرا کے مختلف اضلاع میں رہنے اور وہاں کے ماحول سے آشنا ہونے کے باوجود وحید کو حیدرآباد چھوٹنے کا تازیست غم رہا۔ ان کی نظم حیدرآباد اسی دور کی تخلیق ہے۔ ان منتخب اشعار سے ان کی عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ہر اک نقش تہذیب جو دلنشین ہے
دلِ حیدرآباد اسکا امین ہے
اگر مہر و الفت کی جنت کہیں ہے
تو بلاشبہ یہیں ہے یہیں ہے یہیں ہے

نفاست پرستی ہے دیوار و در سے
تری خاک میں نکہت یاسمیں سے

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی رقمطراز ہیں۔

"۔ حیدرآباد کی تقسیم کے بعد میں خود بھی کافی عرصہ
تک ایک طرح کے Nostalgia میں
مبتلا رہا۔ جب اسکی شدید گرفت ہوتی تو وحید
کی نظم حیدرآباد سے مجھے کافی تسکین ملتی۔" [1]

وحید کی ابتدائی شاعری انکے دور کی عکاس ہے جس میں آزادی
کی جہد اور خوشگوار مستقبل کے روشن امکانات شامل ہیں۔ اسکے علاوہ
جاگیردارانہ نظام سے نفرت نئی افق کی تلاش جیسے موضوعات کو بھی
انھوں نے اپنایا۔ لیکن ان کی اس نفرت میں وہ شدت نہیں تھی۔ جو
مخدوم کے ہاں پائی جاتی ہے۔ مخدوم کی نظم "پرانی حویلی" اور وحید کی
ایک اور نظم کا یہ بند۔

ناقدری ہنر کی شکایت فضول ہے
یاں ہر گدھے کی پیٹ پہ اطلس کی جھول ہے

[1] ڈاکٹر صفی الدین صدیقی "سکندر علی وجد شخصیت اور فن" روزنامہ سیاست
حیدرآباد ۲۱ مئی ۱۹۷۶ء۔ عابد علی خان۔

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محمد احمد سبزواری کہتے ہیں۔

"دراصل یہ اس جاگیردارانہ ماحول پر بھرپور طنز تھا جس کا تابناک سورج اپنی پوری شدت سے دکن کی سرزمین پر چمک رہا تھا اور جس کی گرمی سے مقامی باشندے ہی زیادہ جھلس رہے تھے۔ اور اسی کی لگائی ہوئی آگ نے وہاں ملکی غیر ملکی کا سوال کھڑا کیا۔ جس میں اکثر دونوں ہی طرف کے اہل ہنر پسے" ؎۱

یہی وجہ تھی کہ مخدوم نے کھل کر بغاوت کی جبکہ وجد پس پردہ ہی رہے۔ اس سلسلے میں خود ان کی اپنی فطری احتیاط پسندی اور کچھ بابائے اردو کی تربیت انھیں کھلنے نہیں دیتی۔ اسکے ماوراان کی ملازمت کی پابندیوں نے بھی انہیں منظر عام پر آنے سے دور ہی رکھا۔ جہاں تک ان کے دلی تاثرات تھے وہ حق گوئی کی داد دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود کسی تحریک سے وابستہ نہ ہوتے ہوئے بھی مخدوم اور ان کے ساتھیوں کے مویدرہے۔ ملازمت کی بندھی ٹکی مصروفیات اور قوانین کی حدبندیوں سے

؎۱ محمد احمد سبزواری" اجنتا اور ایلورا کا شاعر: سکندر علی وجد" وجد شاعر اور شخص ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر دہلی۔

تنگ آکر وجد نے قبل از وقت ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی۔ اس کے بعد مختلف ادبی و نیم ادبی اداروں سے انکی وابستگی اور معروف ادبی شخصیات سے قربت نے ان کی شاعری کو ایک نیا رجحان عطا کیا۔ اسی کے ساتھ حکومت کے تنظیمی فرائض اور خود ان کا عمل وتحمل ان کی تخلیقی مرتبت کے سامنے حائل رہے۔ ان کی اس دور کی منظومات میں نئے رجحانات کے پہلو بہ پہلو روایت پرستی اور داخلیت کی کارفرمائی ملتی ہے۔

۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۸ء تک راجیہ سبھا کے رکن کی حیثیت سے سیاست سے وابستگی کے باعث وجد کے مزاج میں قدرے تبدیلی آئی ہے چنانچہ بعد ازاں رکنیت کے اختتام پر بھی ان کے تخلیقی کارناموں پر وہی سیاست کا تھوڑا بہت اثر محسوس ہوتا ہے ان کی نظم "عہد آفریں دس سال" اس کی بہترین مثال ہے ان کے بعض غزلوں کے اشعار سے بھی یہی تاثر ملتا ہے۔ ؎

آتش مزاج وجد میں اب سرکشی کہاں
وہ خاک پائے اہل نظر بن کے رہ گیا

آزادئ ہند کے پہلے اور بعد میں جو جو ادبی تحریکیں رونما ہوئیں وجد نے ان سے بہت کم ہی اثر قبول کیا۔ لیکن جدیدیت کی تحریک سے

قدرے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی آخری دور کی شاعری پر جدیدیت کی چھاپ نمایاں ہے۔ اس ضمن میں ان کی آزاد و معرا منظومات اور ان میں اشاریت کو ملحوظ رکھا جاسکتا ہے۔ اسکے باوجود وجد کے ہاں عصری حسیت کی وہ کسک نہیں ملتی جوان کے ہم عصر اور بعد کے جدید شعراء کے ہاں پائی جاتی ہے۔ البتہ جو چیز ہمیں وجد کے کلام کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس میں پائی جانے والی شعریت اور غنائیت ہے جو انہیں اپنے دور کے دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہے۔

لیکن ــــ آگے چل کر ملک کے معاشرتی وسیاسی حالات، اردو اور اقلیتوں کے حالِ زار اور انکی گرتی ہوئی صحت نے وجد کو خلوت نشین سا بنا دیا۔ وہ یوں بھی اپنے آپ میں رہنے والے اب تو اپنے آپ کے ہو گئے یہ سچ ہے کہ وہ ترقی پسند شعرا کی طرح حالات کا اثر قبول نہیں کیا۔ ان کو اپنی شاعری کا موضوع تو اور بھی کم بنایا لیکن اپنی زندگی کے آخری برسوں میں وجد نے حالات وحوادث سے اوپر لے نیازی اختیار کی۔ سرکاری، سیاسی، اور سماجی حیثیتوں سے ان کو کئی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو انھوں نے جوش وخروش سے کم ہی ان کو قبول اور پورا کیا ترقی اردو بورڈ، انجمن ترقی اردو ہند اور اردو اکیڈمی وغیرہ کے اجلاسوں میں

انہوں نے برائے نام شرکت کی اداکثر و بیشتر علالت بہانہ بنتی رہی۔ ادھر کئی برسوں سے علالت ان کی زندگی کا عنوان بن گئی تھی جس نے دھیرے دھیرے ان کو موت کی آغوش میں پہنچا دیا ۔۔۔ بہرکیف وجد نے حالات زمانہ سے کیسا اور کتنا ہی اثر قبول کیا ہو انہوں نے اپنے دور کی شاعری کو اس سے زیادہ متاثر کیا۔ اس طرح وجد کی زندگی اور انکی شاعری کا پس منظر ایک دوسرے سے وابستہ ہیں ۔۔۔ ۔

حالات زندگی

اورنگ آباد! شعر و ادب کے لحاظ سے سرزمین دکن کا وہ
مردم خیز خطہ ہے۔ جس کو ابتدا ہی سے اردو کے نامور شاعروں کے وطن
ہونے کا افتخار حاصل ہے۔

شہر اورنگ آباد تاریخ میں سب سے پہلے کھڑکی کے نام سے
منظر عام پر آیا۔ پھر فتح نگر اور بعد میں کہیں چل کر اورنگ آباد کہلاتا ہے۔
اکثر مورخین نے تو اسے خجستہ بنیاد لکھا ہے۔ جس سے اس شہر کی تاسیس
کا مادۂ تاریخ نکلتا ہے۔ اس شہر کو تاریخی لحاظ سے بھی بڑی اہمیت حاصل
ہے لیکن اسکی تاریخ میں کئی مد و جزر آئے۔

"کھڑکی" مرہٹی زبان کا لفظ ہے۔ جسکے معنی پتھریلی زمین کے ہیں۔
اس شہر کے اطراف و اکناف چھوٹی بڑی کثیر تعداد میں پہاڑیاں پائی جاتی
ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اسکا نام "کھڑکی" رکھا گیا ہو۔ اسکے کنارے کھام ندی

جسکو گنڈا بھی کہا جاتا ہے بہتی ہے۔ پہاڑیاں، وادیاں اور دریا کا کنارا اس شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں لیکن سچ پوچھیئے تو اس شہر کی قسمت سنہ ۱۶۰۷ء میں سلطنتِ نظام شاہی کے حبشی وزیر ملک عنبر کی قسمت کے ساتھ چمکی۔ ملکِ عنبر اس سلطنت سے وابستہ ہونے کے ساتھ ہی اپنے اثر و اقتدار میں بتدریج اضافہ کرتا رہا اور اس نے جلد ہی ایک مضبوط اور مستحکم موقف حاصل کرلیا اور پھر چاند بی بی کے قتل کے بعد اس نے خود مختار حیثیت حاصل کرلی۔ اسی نے کھڑکی کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور اپنے بیٹے فتح خاں کے نام پر اس کو "فتح نگر" کے نام سے موسوم کیا۔ ملکِ عنبر نے فتح نگر کی ترقی و ترویج آرائش و زیبائش، فلاح و بہبود کے کاموں میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی خصوصاً آب رسانی کا انتظام اس نے بہم پہنچایا وہ بڑا ہی عمدہ اور قابل رشک ہے

سنہ ۱۶۲۶ء میں ملک عنبر کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا فتح خاں تخت نشین ہوا لیکن نظام حکومت میں وہ ملک عنبر کا صحیح معنی میں جانشین نہیں ثابت ہوسکا۔ نتیجتاً سنہ ۱۶۳۲ء میں نظام شاہی سلطنت کے دوسرے علاقوں کے ساتھ فتح نگر بھی مغلوں کے قبضے میں چلا گیا۔

۱۶۵۳ء میں جب شہزادہ اورنگزیب کو دکن کی صوبہ داری ملی تو اس نے فتح نگر کو اپنا پائے تخت بنایا۔ چونکہ اس شہر کی آب وہوا اور محل وقوع اورنگزیب کے مزاج کے مطابق تھے۔ اس کو یہ مقام بہت پسند آیا اور اسی مناسبت سے اس نے فتح نگر کا نام تبدیل کر کے اپنے نام پر اورنگ آباد رکھا۔

اورنگزیب کے انتقال کے ساتھ ہی زوال سلطنت مغلیہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس اثناء میں نواب قمر الدین خان نظام الملک آصف جاہ اول کو اورنگ آباد کی صوبہ داری ملی۔ ملک کی افراتفری اور حکماء کی نااہلی سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے جلد ہی اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور اپنا پائے تخت اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل کر لیا۔ اورنگ آباد کی حیثیت ریاست حیدرآباد کے چوتھے صوبے مرہٹواڑہ کے صدر مقام کی ہوگئی۔ آصف جاہ سابع کے دور میں ۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن کے بعد انقراض حیدرآباد عمل میں آیا اور پھر ۱۹۵۶ء میں لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیم جدید کے نتیجہ میں اورنگ آباد ریاست مہاراشٹرا میں شامل کر دیا گیا اب اسکی حیثیت ضلع کے صدر مستقر کی رہی۔

تاریخی مقامات کی وجہ سے اورنگ آباد کی بڑی اہمیت ہے۔

ہر موسم اور ہر ماہ میں یہاں سیاح جوق در جوق آتے رہتے ہیں۔ خصوصاً موسم سرما اس شہر کی گوناگوں ماحول کے لطف کو دوبالا کر دیتا ہے۔ اگست تا جنوری اس شہر کی رونق کو نکھارنے والے مہینے ہیں۔ یہاں کا اندرونی شہر پناہ کا دروازہ جسکو بھڑکل کہا جاتا ہے ہمیں اپنے شاندار ماضی کی یاد دلاتا ہے۔ اس سے ہوتے ہوئے شہر میں داخل ہوتے ہیں تو شہر کے ایک سرے پر واقع وہ کوہستانی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو اجنتا ایلورا تک چلا جاتا ہے اس کے قریب ہی آگرہ کے تاج محل کے نمونے پر ایک چوکور عمارت مغلیہ دور کے فنِ تعمیر کی یاد تازہ کرتی ہے اسکو بی بی کا مقبرہ کہا جاتا ہے۔ جو مرحوم شہنشاہِ عالمگیر کی رفیقۂ حیات دلرس بانو بیگم (رابعہ دورانی) کی آخری خوابگاہ ہے۔ بھڑکل سے ایک آدھ فرلانگ دور سڑک کے کنارے واقع ہو یلی آرک سے متصل کھام ندی گنگناتی بہتی ہے۔ اس کے کنارے پن چکی ہے جسکی تعمیر نظام الملک آصف جاہ اول کے دور میں ہوئی تھی۔ ان کے علاوہ قلعہ ارک اور تو کنڈہ بھی اپنی تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔

مذکورہ مقامات کے علاوہ نواح اورنگ آباد اپنی تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ اورنگ آباد سے کوئی ۱۳ میل کے فاصلے پر قلعہ دولت آباد

واقع ہے۔ یہ علاقہ محمد شاہ تغلق کے زمانے میں دیوگڑھ کے نام سے مشہور تھا
فتح دیوگڑھ کے بعد محمد شاہ تغلق نے یہ محسوس کیا کہ دیوگڑھ ہندوستان کا مرکز ہے
لہٰذا اس نے اپنا پائے تخت دہلی سے دیوگڑھ منتقل کر لیا اور اس مقام کو
دولت آباد کے نام سے موسوم کیا۔ بادشاہ کے ساتھ اس کے درباری
اہل فن، علماء، شعراء، مورخین، رعایا کے علاوہ بزرگان دین نے بھی
دولت آباد میں سکونت اختیار کی۔ اور یہاں کی آب و ہوا سے اتنا متاثر
ہوئے کہ ان میں سے بیشتر یہیں کے ہو کر رہے۔ لہٰذا دولت آباد قلعہ سے
۵ میل کے فاصلہ پر خلد آباد میں بزرگان دین اولیائے کرام کے مقابر
موجود ہیں۔ جو اپنی پرشکوہ و پر جلال وجمال زندگی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔
ان مزارات میں حضرت شیخ برہان الدینؒ شیخ زین الحقؒ خواجہ منتخب الدین
زر بخشؒ میر حسن دہلویؒ سید راجو پدرؒ میر سید محمد گیسو درازؒ کے علاوہ اور بھی
کئی صوفی اور بزرگ ہستیاں آرام فرماتے ہیں۔ ان بزرگان دین میں
اکثر حضرات سلطان اولیاء حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے آستانے
کے جاروب کش حضرات اور ان کے مرید ہیں۔ ان کے علاوہ خلد آباد میں
اورنگزیب عالمگیر کا مزار بھی واقع ہے۔ جو زبان حال سے ہست و نیست
کی بے ثباتی کا آئینہ دار اور زندوں کیلئے ایک عبرت کدہ ہے۔

اورنگ آباد نہ صرف تاریخی حیثیت سے ہندوستان میں ممتاز ہے بلکہ اسکی علمی فضا بھی اس کی شہرت کا باعث ہے۔ کیا شعر، کیا نغمہ، آرٹ، مصوری، سنگتراشی، نقاشی، علم و ادب، حکمت و عرفان سچ پوچھیئے تو اس سرزمین کی بوقلمونی کیفیات کو بیان کرنے کیلئے الفاظ کی کمی سی محسوس ہوتی ہے۔ وجد کے الفاظ میں مختصر یہ ہے ؎

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ نوابوں کی بستی ہے

اس سرزمین پر فنون لطیفہ کو جو نکھار حاصل ہوا وہ شاید ہی کسی اور علاقہ کو حاصل ہو۔ ایلورا، اجنتا کے شاہکار یہاں کی سنگتراشی و مصوری اور یہاں کی تہذیب و تمدن کے مظہر ہیں۔ اورنگ آباد سے ۲۵ میل کے فاصلے پر اجنتا کے غار پہاڑوں میں تراشے گئے ہیں۔ یہ غار مصوری و رنگ آمیزی کے بہترین شاہکار ہیں۔ اور صدیوں پہلے کی ہندوستانی تہذیب اور مصوری کے حسین نمونے بھی ان مصوروں کا نصب العین تقدس سے بھرپور تھا اور وہ اپنے مذہب کو تصاویر کے ذریعہ مشتہر کرنا چاہتے تھے خلوص اور تخیل کے حسین امتزاج نے ان شاہکاروں کو لاجواب اور غیر انحطاط پذیر بنا دیا ہے۔ ان تصاویر میں بدھ مت کا ایک دور ملتا ہے

مذہب کی ابتداء اور عروج وزوال کو مختلف وہاروں میں بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ مصوروں نے نہ صرف مخلوقات کی تصاویر کھینچی ہیں بلکہ ان میں گویا روح سی پھونک دی ہے۔ یہ تصویریں بظاہر ساکت وخاموش رہتی ہیں مگر اہل نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں۔

اجنتا میں عورت کے ہر روپ اور ہر پہلو کو بڑی خوبی سے نمایاں کیا گیا ہے۔ کہیں وہ رانی نظر آتی ہے تو کہیں رقاصہ کے روپ میں دکھائی گئی ہے۔ اور کہیں زیور سے لدی تو کہیں عریاں و نیم عریاں لیکن یہ تصاویر جسم کی نمائش یا محض عریانی کیلئے نہیں اور نہ محض جمالیاتی حس کی تسکین یا اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے ہیں۔ ان تصاویر کو بنانے کا مقصد پرستش محض ہے۔ بقول وجد وہاں ع

تقدس کے سہارے جی رہا ذوق عریانی

ایلورا بھی فنکاری کا شاہکار ہے۔ دولت آباد سے ۸ میل کے فاصلے پر واقع یہ مقام بھی اتنا ہی شہرت یافتہ ہے جتنا کہ اجنتا۔ ایلورا کے مندروں میں سنگتراشوں نے غارگلازی کے بیشمار نمونے چھوڑے ہیں پہاڑوں کو کھود کر کل ۳۴ مندر بنا دیئے گئے ہیں۔ ان میں بدھ، جین اور برہمن مذاہب کے بت چٹانوں اور ستونوں میں تراشے گئے ہیں۔

ان مندروں میں کیلاش کا مندر اپنے فن کا بے مثال اور مایہ ناز صنم خانہ سمجھا جاتا ہے۔ جس میں ہندوستانی سنگتراشی کے عجیب و غریب نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ خصوصاً لہردار حرکت کو رقص کرتی ہوئی مورتوں میں نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ صرف مشرقی آرٹ خصوصاً ہندوستان کا اپنا حصہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مافوق الفطرت (چار ہاتھ والے دیوی دیوتا) مجسمے بھی تراشے گئے ہیں۔ لیکن ان مجسموں میں وہ سرد مہری نہیں جو اکثر مغربی سنگتراشی میں ملتی ہے۔ لگتا ہے یہ مجسمے نہیں زندہ چلتے پھرتے اور ہماری آپ کی طرح سانس لیتے افراد ہیں جو ابھی آپ سے گویا ہوں گے یا ابھی آپ کا خیر مقدم کریں گے۔

اورنگ آباد ان فنون کے علاوہ شعر و ادب کے میدان میں بھی کبھی پیچھے نہیں رہا۔ تصوف و عرفان کی خوشبو مہکانے والے بزرگوں کے علاوہ اس سرزمین پر "بابائے اردو شاعری" اردو کے چاسر، ولی اورنگ آبادی نہ صرف پیدا ہوئے بلکہ یہیں باغِ سخن کی آبیاری بھی کی۔ اسی فضا میں سراج اورنگ آبادی نے غزل میں تصوف و فلسفے کی چاشنی شامل کی۔ سراج کے ہم عصر میرزا داؤد بیگ نے غزل گوئی میں ایک مثال قائم کی۔ عارف الدین خان عاجز، لچھمی نارائن شفیق بھی

بلاشبہ علم و فضل شعر و شاعری میں اپنی مثال آپ تھے۔ اسی زمانے میں کئی شعراء شمالی ہند سے اورنگ آباد تشریف لائے۔ ان میں غلام علی آزاد بلگرامی بھی تھے۔ جو یہاں کے تشنگان علم و ادب کو سیراب کرتے رہے۔ ملا عبدالقادر شاہ، غلام قادر ساقی، علم و ادب، شعر و سخن میں درس و تدریس کیا کرتے تھے۔ جہیود علی صفی اورنگ آبادی کو بھی اسی خاکِ پر وقار سے اٹھنے کا شرف حاصل ہے۔

بیسویں صدی میں بھی اورنگ آباد کی ادبی فضا اسی طرح جگمگاتی رہی بلکہ اس پر اور نکھار آیا۔ اس دور میں ادب کے گیسو سنوارنے والوں میں "بابائے اردو" مولوی عبدالحق مرحوم پیش پیش ہیں۔ انہوں نے انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد کے پرنسپل کا عہدہ قبول کرنے کے بعد طلباء کی تخلیقی قوتوں کو فروغ دیتے اور ان میں انشاپردازی کے جوہر چمکانے کیلئے ۱۹۲۵ء میں رسالہ "نورس" کا اجرا کیا۔ اس کے علاوہ ایک تحقیقی سہ ماہی رسالہ "اردو" انجمن ترقی اردو کی جانب سے جاری ہوا۔ موصوف چونکہ انجمن ترقیٔ اردو کے معتمد بھی رہے اس لئے انہوں نے انجمن کا دفتر اور مطبع اورنگ آباد منتقل کروالیا۔ موصوف کی مشہور و معروف اردو انگریزی ڈکشنری یہیں سے شائع ہوئی۔

یہی ہے وہ سیاسی معاشرتی اور ادبی پس منظر جس میں ضلع اورنگ آباد کے تعلقہ ویجاپور میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۴ء کو ایک سید پٹیل متوسط گھرانے میں سکندر علی وجد پیدا ہوئے۔ لہ ڈاکٹر صفی الدین صدیقی کے بموجب وجد کی سن پیدائش ۱۹۱۳ء ہے یہ خاندان کوئی صدی پہلے موضع سروالا سے ویجاپور آکر مقیم ہو گیا تھا۔ ویجاپور میں پٹیل خاندان کو اسکی علم دوستی کی وجہ سے شرف امتیاز حاصل تھا۔ خصوصاً اس خاندان کو اردو فارسی شعر و ادب سے بڑا شغف تھا۔ خود سکندر علی کے والد سید عبدالغفور پٹیل جیسے تو ایک آزاد منش لیکن علم و ادب کے شیدائی۔ ان کے والدہ موتی بیگم نے بھی گھر پر سو سو پر خاصی تعلیم حاصل کی تھی۔ عبدالغفور پٹیل حالانکہ انگریزی سے نابلد تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے لڑکوں کو اس سے غیر مانوس نہیں رکھا۔ سکندر علی کو اعلیٰ تعلیم کے لئے جامعہ عثمانیہ میں داخلے کی اجازت بے چوں و چرا مل گئی۔ "والد مرحوم" نظم کے اس شعر سے عبدالغفور صاحب کی فطرت کی عکاسی ہوتی ہے۔ سہ

لہ صفی الدین صدیقی "سکندر علی وجد شخصیت اور فن" روزنامہ "سیاست" حیدرآباد ۲۱ مارچ ۱۹۸۳ء

سنگم بنا ہوا تھا جدید و قدیم کا
زندہ مجسمہ تھا مذاقِ سلیم کا

سکندر علی کے بڑے بھائی سید میر ممتاز علی اور سید میر فیاض علی
بھی اردو و فارسی کے کلاسیکی ادب کے ماہر اور جید عالم تھے۔
اور چھوٹے بھائی سید عبدالرحیم اور عبدالرشید بھی خاصا ادبی ذوق
رکھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنا جوہر نمایاں نہیں کر سکے۔ وجد
کی تین بہنیں بھی ہیں جنکے نام اقبال بیگم، حاجی بیگم اور قمرالنساء ہیں
وجد کے گھرانے میں باقاعدہ مکتب کی تعلیم کا ابھی رواج نہیں تھا۔
وجد اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۰؍ فروری ۸۲ء بنام مریم بلگرامی
میں لکھتے ہیں۔

"ہمارے قبیلے (خاندان تو امیروں، وزیروں اور
مالدار لوگوں کا ہوتا ہے) میں لکھنے پڑھنے کی بدعت
رائج نہیں ہوئی تھی"

لہٰذا سکندر علی کو مکتب سے وابستہ ہونے کیلئے کئی دن لگے
اور کئی مدارس بھی بدلنے پڑے۔ اپنے اس مکتوب میں وجد نے
یوں لکھا ہے۔

۔ بد شوقی اور آوارہ گردی سے اسکول سے دو تین

مہینے میں میرا نام خارج ہو جاتا تھا۔

اس کے نتیجے میں وہ قصبے کے مدارس کے علاوہ اطراف واکناف

کے مدارس سے بھی وابستہ ہوتے رہے۔ بچپن میں وہ مجموعۂ اضداد

بنے ہوئے تھے۔ تمارغ البالی اور آسودہ حالی تو میسر تھی ہی چنانچہ

شرارت اور شوخی بھی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اسکے باوجود

انکی سنجیدہ طینت اور ذہین و متین شخصیت نے انھیں اساتذہ

کا عزیز و رشید بنا رکھا تھا۔

قد آور، چھریرا بدن، گورا رنگ، اونچی اور نکیلی ناک، شعور

نغمہ سے سرشار آنکھیں۔ ان پر نثار ہونے والے ابرو۔ کالے رنگ کا

چشمہ جس کا فریم بھی قد و قامت کی مناسبت سے موزوں ہوتا

چہرہ صاف و شفاف مثل آئینہ جمے جاتے بال جو سر کے صرف

پچھلے حصے پر نظر آتے۔ دوہرا پاجامہ کرتا پہنتے وہ صاف اور شفاف

اور اس پر مکلف شیروانی دیدہ زیب بنتی۔ دلفریب جاذب

شخصیت! انتہائی محتاط مخصوص سلیقہ، رکھ رکھاؤ طور طریقوں

اور ادب و آداب کے علمبردار مختلف مدارس سے وابستہ ہوتے ہوئے

وحید جالنہ کے مدرسۂ فوقانیہ سے منسلک ہو گئے۔ اور یہیں
میٹرک جالنہ ہائی اسکول ہی سے کامیاب کرنے کے بعد ان میں
تعلیم کا صحیح ذوق پیدا ہوا جو انہیں اورنگ آباد لے گیا۔ ان دنوں
سکنڈری اسکول اتنے عام نہیں تھے۔ میٹرکلیشن کے لئے طلباء کو
لمبے لمبے سفر طے کرنے پڑتے تھے۔ اورنگ آباد جانے کے بعد ہی
انکی ذہنی اپج کا باب شروع ہوتا ہے۔ انہیں اورنگ آباد کی
فضا بہت پسند آئی اور وہاں کا ماحول بڑا عزیز ہو گیا اورنگ آباد
کے تاریخی و شعر پرور ماحول نے ان کی طبیعت میں انتا رس گھولا کہ
سنہ ۱۹۳۵ء کے آتے آتے ان کا پیمانۂ فکر لبریز ہو گیا۔ اور اشعار گویا
آپ ہی آپ ڈھلنے لگے۔ ابتداً القول کا مرید کلیم اللہ صدیقی اورنگ آباد کے
مشاعروں میں مترنم آواز میں وحید نے فلکی تخلص کے ساتھ حصہ
لینا شروع کیا۔ ان کا وجد آور مترنم لہجہ و دلکش وجاد و بھری آواز
نے مولانا عبد الرب کوکب حیدر آبادی کو اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے سکندر علی
کو فلکی کے بجائے وجد تخلص اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ وجد نے
اپنے کلام کی جن اساتذہ سے اصلاح لی ان میں سید محمود مغربی
اورنگ آبادی، سید غلام ربانی دہلوی اور سید وہاج الدین شمیم

لکھنوی کے نام یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔ وجد کی شہرت کا آغاز ان کے اس شعر سے ہوتا ہے۔ ؎

وائے دریدہ دامنی گل جو چلے تھے گر گئے
خار ہی خار رہ گئے دامنِ تار تار میں!

اس کے باوجود اس کل ہند مشاعرے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام مہاراجہ کرشن پرشاد شاد کی صدارت میں بی بی کے مقبرے میں ہوا تھا۔ اس کا انتظام کالج کے پرنسپل اور انجمن ترقی اردو کے معتمد مولوی عبدالحق کی نگہداری میں تھا۔ وجد اس وقت میٹرک کے طالب علم تھے۔ مولوی عبدالحق چاہتے تھے کہ اس نوخیز ستارے کو بھی سپہر سخن سے آشنا کرایا جائے۔ انہوں نے وجد کو تاکید کی کہ وہ بھی اس مشاعرے میں حصہ لیں۔ طالب علمی و ناتجربہ کاری کی وجہ سے وجد کشمکش و پیچ میں مبتلا ہو گئے۔ آخر ہمت کر کے اسٹیج پر آگئے اور اپنی مشہور غزل مترنم لہجے میں سنانے لگے۔ جس کے چند شعر یہ ہیں۔

؎ روتے روتے آنکھ میں آنسو کی بوند
گوہرِ نایاب بن کر رہ گئی

اس نظر سے تم نے کیوں دیکھا مجھے
ہر تمنا خواب بن کر رہ گئی
وجد کیا معلوم کیا بنتی وہ شئے
جو شراب ناب بن کر رہ گئی

صدر مشاعرہ مہاراجہ کرشن پرشاد شاد صدر اعظم دولت آصفیہ کو اس غزل کی انوکھی ادا اور غزل خواں کا مترنم لہجہ بڑا ہی دلکش معلوم ہوا۔ انھوں نے ہر شعر پر ایک ایک اشرفی عطا فرمائی۔ اس بر وقت ہمت افزائی و سرفرازی کا وجد کے حوصلوں کو بلند کرنے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے میں بڑا ہاتھ ہے۔

مولوی عبدالحق کو وجد پر بڑا ناز تھا۔ وہ انھیں بے حد چاہتے اور قریب رکھتے تھے۔ جب وجد میٹریکلیشن میں کامیاب ہوئے تو انھوں نے اسی کالج میں داخلہ لیا جسکے پرنسپل مولوی عبدالحق صاحب تھے۔ مولوی صاحب کی جوہر شناس نظر نے نہ صرف وجد کے مضمر جوہر کو نمایاں کیا بلکہ انھیں اور نکھارا سنہ ۱۹۲۲ء میں انھوں نے انھیں انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد کے

میگزین "نورس" کا ایڈیٹر منتخب کیا۔ اس کا انھیں کامل علم تھا کہ یہ صدف برابر موتی لٹاتے رہے گا۔ ہر سال تک مولوی صاحب کی قربت نے وجد کی ترقی میں چار چاند لگائے۔ جب وہ انٹرمیڈیٹ کے بعد بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کیلئے جامعہ عثمانیہ میں داخل ہوئے۔ تب بھی مولوی صاحب کا ساتھ رہا۔ استاد محترم کا شاگرد رشید کے داخلے سے پہلے ہی جامعہ میں بحیثیت استاد شعبۂ اردو میں تقرر ہو چکا تھا اب اکثر اوقات مولوی صاحب کے دیوان خانے میں ان کی نشست ہوا کرتی جس میں کئی ادبی و نیم ادبی پہلوؤں پر بحث ہوا کرتی۔ اکثر چہل قدمی کے وقت وہ مولوی صاحب کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اس کے باوجود وجد نے عبدالحق سے پاس وہ مقام حاصل نہیں کیا جو شیخ چاند نے حاصل کیا تھا۔ اس کا سبب عبدالحق صاحب اور وجد کے مزاج و منہاج کا فرق تھا۔ وجد شاعر تھے اور عبدالحق محقق۔ اس کے برخلاف شیخ چاند عبدالحق صاحب کی طرح تحقیق کے مرد میدان تھے۔ لہذا شیخ چاند محقق و منتظم عبدالحق صاحب کے

دستِ راست بنے رہے۔ اسکے باوجود مولوی عبدالحق صاحب کا یہی منشا تھا کہ وحید انجمن ترقی اردو کے ہمہ وقتی کارکن بن جائیں۔ لیکن ایک وسیع کنبے کی کفالت کا ذمہ وحید کو مولوی عبدالحق اور خود انکی اپنی خواہش کو ترک کرنے کا باعث ہوا۔ وحید اور مولوی صاحب کے لگاؤ کا اندازہ ہمیں پروفیسر رفیعہ سلطانہ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے۔

"اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب نے کئی کتابیں لکھیں لیکن وحید کی ذات میں انہوں نے جو پیش لفظ کو ترتیب دیا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے" ؎۱

وحید نے عبدالحق کی قربت سے ہمہ جہت استفادہ کیا مولوی صاحب کی تحریر کی نقل کرنے میں اپنے فن کو اتنا چمکایا کہ بیک وقت دونوں کی تحریر مشابہ ہوتی تھی۔ ایسا بھی ہوا کہ کبھی کبھی مولوی صاحب کی فرمائش پر یا پھر کبھی خود اپنی طرف سے لوگوں کو مولوی صاحب کے سفارشی مراسلے

؎۱ پروفیسر رفیعہ سلطانہ " فن اور فنکار " مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد ص۱۵ اشاعت اول ۲۷ر نومبر ۱۹۶۱ء

لکھ دیا کرتے تھے۔ مراسلہ الیہ کو اسکا مطلق پتہ نہ چلتا۔ اور
مولوی صاحب کو اس وقت پتہ چلتا جب لوگ اپنا کام ہونے
کے بعد شکریہ ادا کرنے کے لئے ان کے پاس آتے۔

جس زمانے میں وجد نے جامعہ عثمانیہ میں قدم رکھا اسوقت
جامعہ کا پہلا دور رخصت ہورہا تھا اور دوسرے دور کے آنے
کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ پرنسپل کا عہدہ برخواست
ہوچکا تھا۔ اور اسکی جگہ وائس چانسلر کا تقرر ہونے والا تھا
کالج کو یونیورسٹی سے موسوم کیا جا رہا تھا۔ اور ساتھ ہی جامعہ
اکیڈمیٹ میں منتقل ہونے والی تھی۔ مخدوم سازِ ہمتریں اور
میکش مطلع سخن پر طلوع ہوچکے تھے۔ ان کی نغمہ سنجیوں
سے حریم جامعہ گونج رہی تھی۔ بلاشبہ اورنگ آباد کی فضائے
وجد کو سپہر سخن سے روشناس کروایا تھا۔ لیکن جامعہ
عثمانیہ کی پرلطف فضا نے انھیں سپہرِ شعر و ادب پر ایک
منفرد مقام تک پہنچا دیا تھا۔ جہاں انکے ہم عصر پر بھی نہیں
مار سکتے۔ انکی وضع ہی شعرائے جامعہ سے مختلف تھی
ابقولِ جیلانی بانو۔

نہ سب شاعروں میں کوئی چہرہ الگ پہچانا جاتا
تھا۔ تو وہ وحید صاحب تھے۔ سفید کلف لگے
بے داغ کپڑوں میں جگر مگر کرتے ہوئے وحید
صاحب جنھیں دیکھ کر خیال آتا کہ یہ کوئی شاعر
نہیں فرشتہ ہیں" [1]

ان کا سلیقہ رکھ رکھاؤ اور آداب ہی منفرد تھے۔ بیحد
منکسر المزاج ویسے چہرے سے رعب داب بزرگی و شرافت
جھلک پڑتے تھے۔ انھیں ہر لحظہ اپنی ریشمی شیروانی
کے بٹن اور کالر کا خیال رہتا تھا۔ کیا مجال جو ان کی شیروانی
پر کسی قسم کا داغ دھبہ نظر آ جائے۔ یوں منکسر المزاجی کے باوجود
ان کا سراپا کر و فر کا حامل مغرور سا دکھائی دیتا تھا۔ انہوں نے
جو وہ کہا ہے ۔

خاکساری کو چھپانے کیلئے وحید مغرور نظر آتا ہے

بالکل ٹھیک ہے۔ ظاہر داری کی قدرا اس وقت ڈھیلی

---

[1] جیلانی بانو "آج کی طرف دیکھو" روز نامہ منصف [illegible]
۲۰ مئی ۱۹۸۳ء

اور ان کی اصلیت مترشح ہوتی۔ جب وہ شعر سنانے کیلئے سَرِ نشین پر آتے۔ شعر کا ہے کو سناتے وہ تو ہمہ تن شعر بن جاتے۔ یہی سپردگی ان کی شہرت کا راز اور ان کے اشعار کی مقبولیت کا جواز تھی۔ ان کی آواز صرف آواز ہی نہیں بلکہ نغمہ تھی جو صرف وجد آور ہی نہیں بلکہ اپنے اندر پیغمبرانہ لہجہ لئے ہوئے ہوتی ؎

حریفِ نغمہ ہے اندازِ گفتگو میرا
ازل سے فطرتِ چنگ و رباب لایا ہوں

بقولِ وحید اختر:

"ان کا ترنم یگانہ کے ایام جوانی کے ترنم سے بہت مشابہ تھا ان کے یہاں یگانہ کی بے دماغی و بے نیازی بھی ملتی ہے لیکن انانیت اور دنیا سے بیگانگی نہیں۔" لہ

۱۹۳۵ء میں دکھنی نے جامعہ عثمانیہ سے بی اے اول درجے میں کامیاب کیا۔ اردو اور فارسی میں جامعہ میں اول آنے پر

لہ وحید اختر وجد شاعر و شخص ... ماہنامہ بمبئی ۱۹۸۵ء

انھیں وظیفۂ امتیاز عطا کیا گیا۔ بی اے کی کامیابی کے ساتھ ہی انہوں نے ایم اے سال اول میں داخلہ لیا۔ اقبال سے دلچسپی نے انھیں کلام اقبال پر تحقیق مضمون لکھنے پر آمادہ کیا۔ جو بالِ جبریل پر تنقیدی حیثیت رکھتا ہے اور مجلۂ عثمانیہ ۱۹۴۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اقبال پر مزید تحقیق کرنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں اقبال سے خط و کتابت بھی کی تھی لیکن بڑھتی ہوئی گھریلو ذمہ داریوں اور سمٹتی ہوئی زمینداری نے انھیں حیدرآباد سول سروس کے مسابقتی امتحان میں شرکت پر مجبور کیا۔ وحید کو وراثت میں ایک بڑا کنبہ اور ایک مرصع تلوار ملی تھی۔

وحید نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں نہ صرف اشعار کہے بلکہ کئی ایک انشائیہ تبصرے اور تحقیقی مضامین بھی لکھے۔ "حیدرآباد سے بمبئی تک" ایک سفرنامہ ہے جو تین دن کی بمبئی کی پکنک کے دوران تحریر کیا گیا تھا بالِ جبریل، رازِ مسرت، اور اقبال کی غزلیں ان کے

تحقیقی مضامین میں "MR DISMAY" بھی ان کا ایک
دلچسپ اور طنزیہ مضمون ہے جو انہوں نے انگریزی میں لکھا
ہے۔ اس مضمون میں اپنے ایک ہم جماعت دوست کا خاکہ اڑایا گیا
ہے۔ جو بے حد درجہ احساس برتری کا شکار تھے۔

وجد کی تعلیمی صلاحیت سے متاثر ہو کر ۱۹۳۶ء میں انھیں
جامعہ عثمانیہ کے سہ ماہی رسالہ "مجلہ عثمانیہ" کا مدیر منتخب کیا
گیا۔ وجد نے اپنی علمی صلاحیت کے باعث ایچ۔ سی۔ ایس
کے مسابقتی امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ دریں اثناء سر اکبر حیدری
صدر اعظم دولت آصفیہ کو وجد کی نظم "تاج محل" بہت پسند
آئی۔ انہوں نے وجد سے اجنتا کے غاروں پر بھی ایک نظم
لکھنے کی فرمائش کی اور تنخواہ کے ساتھ ایک سال کی رخصت
عطا کی۔ ان ہی دنوں وجد نے اسٹیٹ ہوٹل اورنگ آباد اور
اجنتا کے گسٹ ہاؤز میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے قیام
کیا تھا۔ ایچ۔ سی۔ ایس کے امتحان میں منتخب ہونے کے بعد
انھوں نے تعلیم ترک کر دی۔ ہر سویلین کو منتخب ہونے کے
بعد تین سال تک تربیتی مرحلے سے گزرنا پڑتا تھا۔

پہلے معمول سروس ہاؤز میں بسر ہوتا تھا اور
ٹریننگ کلاسس صبح چھ بجے سے شام کے آٹھ بجے تک
مسلسل ہوتی رہتی تھیں سال کے اختتام پر انھیں امتحان
دینا ہوتا تھا۔ دوسرے سال ریاست حیدرآباد کے تمام
شعبہ جات میں عملی تربیت ہوتی تھی اور تمام متعلقہ
محکمہ جاتی امتحانات میں کامیابی کے بعد پروبیشنرز (Proba
tioners) کو مختلف محکموں کے لئے منتخب کیا جاتا تھا
جن میں مسال Finance آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس پولیس
عدالت اور محکمہ پٹہ شامل تھے اور ہر پروبیشنر کو برطانوی
ہند کے کسی صوبے میں مزید ٹریننگ کیلئے بھیجا جاتا تھا
اور تقرر کیلئے وہاں سال کے اختتام پر امتحان میں کامیابی
لازمی تھی۔ سکندر علی وجد کو عدالتی شعبہ کیلئے منتخب
کیا گیا اور ۱۹۳۷ء میں عدالتی ٹریننگ کے سلسلہ میں وہ
سیتاپور (اودھ) (صوبۂ متحدہ) روانہ ہوگئے۔ یہ ٹریننگ
۱۹۳۹ء تک رہی۔ اس عرصہ میں وہاں انکی ملاقات اردو کے
نامور شاعر جعفر علی خاں اثر لکھنوی سے ہوئی۔ اب وجد کے

تخیل و تفکر میں ایک نیا عنصر شامل ہوگیا۔ وہ فن جس پر
اورنگ آباد اور حیدرآباد کی چھاپ تھی اب لکھنو کے رنگ
سے بھی مانوس ہوگیا۔ اور اب انکی شاعری نہ صرف دکن
بلکہ شمال خصوصاً لکھنو وغیرہ میں مشاعروں کے ذریعہ
معروف ہوچکی تھی۔ حیدرآباد کو وجد کی فرقت کب
گوارا تھی گوکہ ان کے ہم عصر یہاں موجود تھے۔ عبدالحق اکیڈیمی
حیدرآباد دکن نے اس فرقت کو ایک حد تک دور کرنے
کیلئے اپریل ۱۹۶۲ء میں وجد کے کلام کا پہلا مجموعہ
لہو ترنگ شائع کیا۔ جس میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۶۱ء تک کا
منتخب کلام شامل ہے۔ اس مجموعے میں کل ۶۰ منظومات
اور ۲۷ غزلیات بڑے ہی سلیقے سے ترتیب دئیے
گئے ہیں۔ وجد نے اس کا منظوم دیباچہ جنوری ۱۹۶۱ء
میں مرقوم کیا تھا جو مسدس کی شکل میں سات ترکیب
بندوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کی خصوصیت خود
اس کے نام سے مترشح ہے۔ "لہو ترنگ" دراصل
اقبال کے ایک قطعہ سے لیا گیا ہے۔ ؎

۱۸۵

ق ۶ جبتک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

یہ زورِ دستِ ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت "لہو ترنگ" ہے غافل نہ "جل ترنگ"

اس مجموعہ کے دیباچے اور اس کے پیش کردہ قطعے سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وحید ابتداء میں انیس اور اقبال سے متاثر رہے۔

شعبۂ عدلیہ سے منسلک ہونے کے بعد انہوں نے اپنے آپکو ممکنہ حد تک کم آمیز بنالیا تھا۔ جب کوئی ان سے شعر سنانے کی فرمائش کرتا تو متحیر نظروں سے اسکو دیکھتے۔ اس زمانہ میں بھی اگر وہ کسی شخص کو شعر سناتے تھے تو وہ صرف ان کے ایک دوست اشفاق حسین مرحوم تھے۔ یوسف ناظم اپنے ایک مزاحیہ مضمون "کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں" میں لکھتے ہیں۔

۔ صرف وہ سودا ہیں اشفاق حسین تھے جسے

وجد صاحب اصرار کر کے اپنا کلام سناتے اور

اسکی معقول قیمت ادا کرتے تھے۔" لہ

اشفاق حسین وجد کے قریب ترین ساتھی رہے۔

بقول ڈاکٹر مجید بیدار وجد:

"اشفاق صاحب کا ذکر بہت ہی والہانہ وابستگی

کے ساتھ کرتے تھے۔" لہ

و نیز وجد اپنے کلام پر صرف اشفاق حسین کی رائے کو ضروری

سمجھتے تھے۔ خود لکھتے ہیں۔

میرے دوست سید اشفاق حسین مرحوم اردو

ادب کے ایک دیدہ ور نقاد تھے۔ جسطرح غالب

مصطفےٰ خاں شیفتہ کی پسند کے بغیر اپنی غزل

دیوان میں نہیں لکھتے تھے۔ اسی طرح میں بھی

لہ یوسف ناظم "کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں" ماہنامہ کتاب نما

دہلی مارچ ۱۹۸۲ء

لہ مجید بیدار حضرت وجد کی زندگی کا آخری دور ۲۳ مئی ۱۹۸۳ء روزنامہ

"منصف" حیدرآباد۔

اشفاق کے مشورے کو اہم سمجھتا تھا۔" ۱؎

ایام طالب علمی میں ان کا کمرہ بقول اشفاق حسین مرحوم سماع خانہ تھا۔ اس سلسلے میں مرزا ظفر الحسن لکھتے ہیں:

"وحید ہمیشہ کا خوش الحان تھا۔ اشفاق نے اس کے کمرے کا نام سماع خانہ رکھا۔" ۲؎

وحید اگرچہ سنجیدہ مزاج تھے پھر بھی حاضر جوابی برجستہ گوئی اور بذلہ سنجی ان کے اوصاف میں شامل تھے۔ مزاج کا شگفتہ پن ہر محفل میں ایک دل خوش ماحول پیدا کرنے کیلئے کافی تھا۔

رونق محفل احباب ہے یہ مرد نحیف !!
سخت بے باک جنوں کیش خدا ترس ظریف

وحید نے اپنی زندگی کو بڑا محتاط بنا رکھا تھا۔ خط وکتابت کے سلسلے میں وہ بالکل کمزور تھے۔ جہاں تک باقاعدہ

۱؎ سکندر علی وجد کلیات جلال اختتا جلال بحوالہ دیباچہ سکندر علی وجد زیر طبع۔
۲؎ مرزا ظفر الحسن "ذکر یار چلے" حامی بکڈپو مچھلی کمان حیدرآباد مارچ ۱۹۷۹ء پہلی بار ص ۲۰۳

۷۷

خط و کتابت کا تعلق تھا وہ بلگرامیوں کے علاوہ کسی اور سے زیادہ نہیں رہا۔ بے حساب خطوط آئے لیکن کسی کا جواب دینا انھیں پسند نہیں تھا۔ راقم الحروف نے خود اپنی تحقیق کے سلسلے میں کئی خطوط لکھے۔ لیکن وحید نے جیسا کہ ان کا مزاج تھا جواب کا مستحق نہیں سمجھا۔ اس باب میں ہم ایک ہی نہیں خود انکے عزیز و اقارب بھی آجاتے ہیں۔ ڈاکٹر مجید بیدار کے یہ سطور وحید کی شخصیت کے اس پہلو پر کافی روشنی ڈالتے ہیں :

بے حساب خطوط آتے لیکن کبھی کسی کا جواب تک نہ دیتے تھے۔ اگر از حد ضرورت ہوتی تو ایک پوسٹ کارڈ پر چند جملے تحریر کیے اور مقصد بیان کر دیا چنانچہ ایک دفعہ انھیں علامہ اقبال کے ایک غیر مطبوعہ خط کی ضرورت تھی جو جسٹس شرف الدین کے پاس محفوظ تھا۔ مجھے پوسٹ کارڈ پر چند سطور لکھ کر وہ خط لانے کی تاکید کی۔ مسز سلطانہ شرف الدین سے ملاقات پر انھوں نے وحید صاحب کا

احتراماً ذکر کرتے ہوئے اظہار خیال کیا کہ وحید تو خط لکھتے ہی نہیں۔ بھلا ایک کسان پیشہ سے تعلق رکھنے والے کو لکھنے پڑھنے سے کیا تعلق"۔ [1]

لیکن انکی وضعداری تو ماشاءاللہ بقول جیلانی بانو :

" وحید صاحب ہمیشہ اندھیرے میں اجلی کرن کی طرح نمایاں نظر آتے تھے" [2]

سکندر علی وجد کے ایک دوست مرزا ظفرالحسن وحید کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

" افسر کی انا سکندر میں طالب علمی کے زمانے سے تھی۔ اس پوت کے پاؤں مجھے پالنے میں ہی اسی دن سے نظر آنے لگے جبکہ وہ اور میں عارضی اقامت خانے میں ایک ساتھ بیٹھ کر انگریزی نثر یاد کرتے تھے میں اگر اسے صحیح مفہوم سمجھاتا تا اور وہ

[1] ڈاکٹر مجید بیدار "غزل کی آبرو حضرت وحید کی زندگی کا آخری دور" روزنامہ منصف ۲۲ رمئی ۱۹۸۳ء حیدر آباد۔

[2] جیلانی بانو "آج کی طرف دیکھو" روزنامہ منصف ۲۲ رمئی ۱۹۸۳ء حیدر آباد۔

اسے غلط سمجھتا یا پسند نہ کرتا تو مجھے ڈانٹ
دیتا اور کہتا تھا۔ گدڈو تونے یہ مطلب کسی
اینگلو انڈین دوست سے سنا ہوگا یاد رکھنا
اس چھوکری پہ نظم لکھ دوں گا۔ اس نے
بہت کم ساتھیوں کو منہ لگایا۔ ؎۱

مرزا ظفر الحسن کے الفاظ اور لفظ گدڈو کے استعمال سے
ہمیں وجد کی شخصیت اور طبیعت کی افتاد کا اندازہ ہو جاتا
ہے کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ بہت تر کو دکنی
میں گدڈا کہا جاتا ہے اور اس مناسبت سے انہیں گدڈو کہنا
اور پھر ان کے صحیح مطلب بیان کرنے پر بھی انا قائم رکھتے
ہوئے یہ کہنا کہ "یاد رکھنا اس چھوکری پر نظم لکھ دوں گا"
بڑا ہی پر لطف انداز معلوم ہوتا ہے۔ ظفر الحسن نے
وجد کی گالیوں کو بھی کاف دار کہا ہے اور آگے چل کر
لکھتے ہیں:

؎۱ مرزا ظفر الحسن "ذکر یار چلے" ساہی بکڈپو حیدر آباد۔
۱۹۷۹ء پہلی اشاعت۔

"۔ سکتے ہر ایک کو اپنی گالی کا بھی مستحق نہ سمجھتا تھا۔" [۱]

وحید کا رکھ رکھاؤ اور نشست و برخاست کچھ ایسے
تھے کہ لوگ انھیں مغرور بھی متصور کرتے تھے۔ سید
شہاب الدین دسنوی رقمطراز ہیں:

"کئی بار تاج کی چائے پینے کے بعد میں نے اس
اصرار بے جا پر احتجاج کیا تو اس کا نعم البدل
فلورا فاؤنٹین کے ایک ریستوران میں نکالا گیا
جس کا نام بگاڑ کر ہم پرکینز کہا کرتے تھے۔ یہاں
چائے بھی اچھی ہوتی ہے اور سستی بھی۔" [۲]

یہ تھا وحید کا رکھ رکھاؤ کھانے پینے اٹھنے بیٹھنے غرض ہر
معاملے میں وہ بڑے ہی نفاست پسند تھے۔
وحید کی سلیقہ مند فطرت کے سب دلدادہ تھے۔
دوست و احباب انھیں اشفاق کی ضد میں یاد کرتے تھے
وحید کی نفاست پسندی ہمیشہ اشفاق حسین کی گالی کا کلیجہ

---

[۱] مولانا ظفر الحسن "ذکر یار چلے" حسامی بکڈپو حیدرآباد ۱۹۸۹ء پہلی اشاعت

[۲] سید شہاب الدین دسنوی "وحید شاعر و شخص" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بمبئی ۱۹۸۲ء۔

سامنے دھری کی دھری رہ جاتی تھی۔

وحید عالمِ جوانی میں بھی صحت وتندرستی کی طرف سے غیر مطمئن سے رہے اور اپنی صحت کے تعلق سے ہمیشہ وہموں کا شکار وہ اکثر بیمار رہتے تھے۔ اور اس سے زیادہ بیماری کے بارے میں متوشش انکی وضع قطع ہی منفرد اور انوکھی ہوتی تھی۔ ڈاکٹر ان کی بیماری سے اکثر اور بیشتر ان کی خود پسندی سے خائف رہتے تھے۔ بسا اوقات تو ڈاکٹروں کو مرض کی تشخیص ہی میں کافی پریشانی ہوتی تھی اکثر کہتے تھے۔ وحید صاحب آپکی بیماری بھی نظم کی طرح انوکھی ہوتی ہے۔ اور پھر ان کو دوا بھی ان کے پسند کی دینی پڑتی تھی۔ یوسف ناظم اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں:

: وحید صاحب دواؤں کا انتخاب بھی اپنی پسند سے فرماتے ہیں[1]

وحید اپنی ساری لیاقت صرف دواؤں اور کتابوں میں صرف کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن وہ کتابوں کو اکھٹا

---

[1] یوسف ناظم "کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں" ماہنامہ کتاب نما بمبئی مارچ ۱۹۶۲ء

کرنے کے عادی نہیں تھے۔ بلکہ اس کے صحیح تصرف کیلئے
کسی دوست کو تحفہ دے دیا کرتے تھے۔ و نیز سواری پر
یا تھا ریب پر بھی وہ روپیہ صرف ہی نہیں کرتے تھے۔
سواری کیلئے بڑی مشکل سے ایک کار خریدی تھی لیکن
ان کی خود روی اور انانیت پسندی کی زد میں ہر شوفر کی
انا کو ٹھیس پہنچتی تھی۔ نتیجتاً چند ہی دنوں میں کئی شوفروں
کو بدلنا پڑا لیکن ایک دیدہ ور شوفر نے ان کی سواری ہی بدلا کر
ان کی انانیت پسندی کو برقرار رکھا کیونکہ ایسا نہ ہوتا تو یا کوئی
حادثے کا خدشہ تھا یا پھر ان کی ناگواری کا اندیشہ چنانچہ
وجد نے پیدل چلنا ہی مناسب سمجھ رکھا تھا۔ ان کی کم آمیزی
کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے ایک رفیق اشفاق حسین تحریر
کرتے ہیں۔

"یوں تو میں نے لوگوں سے وجد کی تہذیب و
شرافت کی تعریف ہی سنی لیکن اسکی کم آمیزی،
بے نیازی، اور بے التفاتی کو ناواقف لوگ
غرور اور مردم بیزاری سے تعبیر کرتے ہیں

حالانکہ یہ تعبیر بالکل غلط ہے۔" له

وسعت حلقہ یاراں اسے منظور نہیں
یہ حقیقت ہیں کم آمیز ہے مغرور نہیں

پہلی دوسری ملاقات کے بعد ہر ناواقف کیا واقف آدمی تک یہی رائے ہو سکتی تھی۔ لیکن وحید مردم شناس تھے بعض لوگوں کو انہوں نے ان کے پنہاں امکانات کی بنا پر یا پھر ان کی طبیعت کی اعتماد کی بنا پر اپنے سے زیادہ دور رکھنا گوارا نہیں کیا۔ تمکین شاکر وحید کی شرافتِ طبع پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں:

"وہ اپنی عمر سے چھوٹے افراد کی بھی بے حد عزت اور قدر کرتے تھے۔ بشرطیکہ یہ تھی کہ وہ اپنے فن میں پختہ ہوں وحید صاحب ان سے ملکر بہت خوش ہوتے تھے۔ ان کی بڑی خاطر تواضع کرتے تھے۔ اگر ملاقات کئی دفعہ

له اشفاق بیاض مریم - سوئیر حسین وحید اورنگ آباد

تک نہ ہوتی تو خود انکے گھر جاتے تھے۔ [1]

لہو ترنگ کی اشاعت کے بعد ان کی عملی زندگی کا آغاز ہو جاتا ہے۔ عدالتی ٹریننگ کے بعد منصفی کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا۔ ان مصروفیات کو پیش نظر رکھ کر اگر کوئی ادبی ذوق شاعر ہوتا تو شاعری سے منہ پھیر لیتا لیکن وحید کا ذوق چونکہ حقیقی تھا اسلئے وہ ان دونوں مشغلوں میں آگے بڑھتے رہے۔

دن بھر تو وہ سرگرم عمل ظلم کا دشمن
انصاف کناں عدل کے ایواں میں ملیگا
اکثر شب مہتاب میں وہ شاعر فطرت
سرگرم سخن بزم سخنداں میں ملیگا

وحید کی شاعری سے اردو دنیا یوں بھی واقف تھی۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں غلام یزدانی ناظم آثار قدیمہ جو فرحت اللہ بیگ کے رفیق عزیز تھے۔ انہوں نے ایک مضمون انگریزی میں "MODERN URDU POETS OF HYDERABAD" حیدرآباد کے

---

[1] معین شاکر: وحید شاعر و شخص، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ بمبئی سنہ ۱۹۸۵ء

جدید شعرائے اردو" لکھا۔ اس مضمون میں فضل الرحمٰن ۸۲
سکندر علی وجدؔ، بیکسؔ اور مخدوم محی الدین کی شاعری کا تعارف
و ترجمہ مع حالاتِ زندگی شامل ہے یہ مقالہ رسالہ" اسلامک
کلچر" جنوری ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ یہی وہ پہلا مقالہ تھا
جس کے ذریعہ وجدؔ کی شاعری غیر اردو داں طبقہ سے
متعارف ہوئی۔ اس مقالہ میں وجدؔ کی منظومات اورنگ آباد
اجنتا، نرس اور میکدہ کا ترجمہ اور ان کے اندر پائے
جانے والے فلسفیانہ نکات کو نمایاں طور پر انگریزی
میں پیش کیا گیا ہے۔

وجدؔ کا شہرہ اسی زمانے میں دور دور تک پہنچ
چکا تھا۔ جبکہ وہ طالب علم تھے۔ مخدومؔ نے بھی اپنی
طالب علمی کے زمانے میں شہرت پائی لیکن یہ شہرت
انھیں وجدؔ کی شہرت کے بعد نصیب ہوئی۔ وجدؔ اسلاف
و اساتذہ کا احترام کرتے ہوئے مقبول ہوئے لیکن
مخدومؔ اسلاف کی روایات سے منحرف تھے ۱۹۳۰ء
سے ۱۹۴۷ء تک وجدؔ کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ

حسن کا عالم جھومنے لگتا تھا۔ وحید منصف کی ٹریننگ
ٹریننگ پوری کر لینے کے بعد حیدرآباد ہائی کورٹ
میں رجسٹرار کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ ان کی شکیل
وضعدار شخصیت انکی علمی استطاعت اور بحیثیت شاعر
ان کی مقبولیت دیکھ کر حیدرآباد اور اورنگ آباد کے
متعدد معزز خاندانوں کی خواہش تھی کہ وحید ان ہی کے
خاندان کے فرد بن جائیں لیکن وحید نے ۱۹ر جولائی
۱۹۴۷ء کو اپنے ہی ایک عزیز سید فیاض علی التعاطف
اور نور بانو (جو بمبئی میں مقیم تھے) کی دوسری صاحبزادی
زبیدہ خاتون سے بیاہ رچا کر یہ ثابت کر دیا کہ وحید
حیدرآباد یا اورنگ آباد کے کسی ایک خاندان میں داخل
ہو کر دوسرے خاندان کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ
ان کا مسلک اپنے قدر دانوں کو شہر ... عیش کرنا تھا
اس سلسلے میں ان کے مزاج کی کنبہ پروری ... روایت کو
ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔

وحید ایک باحوصلہ مرد، بلند اخلاق فرد، سنجیدہ طبع

سوسائٹی کے محترم نمائندے رفیقوں کے رفیق اور قدردانوں کے شفیق تھے۔

سنا ہے وجد ہے اچھا سخنور
کون کہتا ہے اچھا آدمی ہے

کسی بنا پر موقع پر فی البدیہہ شعر کہدینا ان کے لیے کوئی خاص بات نہیں تھی ۱۹۴۷ء کے بعد کی بات ہے جبکہ وجد کنٹر میں منصفی کے عہدے پر فائض تھے۔ ان ہی دنوں وہ بیجاپور سے کنٹر واپس ہو رہے تھے ان کا گذر اورنگ آباد سے ہوا۔ اسی موقع پر خواجہ منتخب الدین زرزری بخش رح کا عرس شریف تھا۔ جب انھیں راستے میں اسکا پتہ چلا تو انہوں نے اپنا سفر ملتوی کر کے وہاں قیام کیا اور ایک پر عقیدت رباعی کہی

اے صاحب الطاف و کرم حضرت زربخش رح
میری شب تاریک کو انوار سحر بخش
دنیا میں جو نایاب ہے وہ چیز عطا کر
زر کی مجھے کچھ فکر نہیں ذوق نظر بخش

اسکے علاوہ نظم "مزدوروں کا پیغام" بھی اسی طرح
سمرٹس کالج کے معماروں کو عمارت کی تکمیل کے بعد
واپس جاتے دیکھ کر فی البدیہہ کہی گئی تھی۔
لسانی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیم جدید سے
پہلے وحید آندھرا کے بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کے
ممبر کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ ان کی استعداد ہمہ گیر
تھی۔ اسی طرح انکی رسائی بھی صرف ایک صوبے میں
محدود نہ رہی۔ جتنی دور تک اردو کا پیغام جا سکتا ہے
وحید کا گذر بھی وہاں تک ہو جاتا ہے۔ آخری عمر میں
وہ ریاست مہاراشٹرا سے وابستہ رہے۔ اور عرصے
تک وہاں کے بورڈ میں اردو نصاب کے ادبی نگراں بھی
رہے۔

سنہ ۱۹۵۲ء میں انہوں نے اپنا دوسرا مجموعہ کلام
"آفتاب تازہ" چیتنا پرکاش لمیٹیڈ حیدرآباد سے طبع
کروایا۔ اس مجموعہ میں ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۲ء تک کے کلام
کو مرتب کیا جسمیں کل ۳۱ منظومات اور ۳۱ غزلیات

ہیں۔ وحید نے 'لہو ترنگ' کی طرح دوسرے مجموعے کا نام بھی
اقبال کے ایک شعر سے لیا ہے۔

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

اسی سال انجمن ترقی اردو ہند نے وحید کے کلام کا ایک
انتخاب شائع کیا جس میں ۱۹۳۷ء سے ۱۹۵۲ء تک کا
منتخب کلام شامل ہے جو "لہو ترنگ" اور "آفتاب تازہ"
میں موجود ہے۔

عدالتی شعبہ میں ترقی کرتے کرتے ۱۹۵۲ء میں
وحید ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سشن جج کے عہدے پر
فائز ہوئے۔ نظام آباد، اورنگ آباد، ناندیڑ، گنٹور میں اسپیشل
افسر کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اسی اثنا ۱۹۶۳ء میں
اپنا تیسرا مجموعۂ کلام "اوراق مصور" ادبی پبلشنگ پریس
بمبئی سے شائع کروایا۔ اس مجموعہ میں کل ۵۹ منظومات
اور ۴۳ غزلیات شامل کی گئی ہیں۔ ان میں لہو ترنگ کی ۲۲
منظومات اور ۱۶ غزلیں بھی شامل ہیں۔

"اوراقِ مصور" میں وحید کا ایک مفصل اور مستند دیباچہ بھی شامل ہے۔ جس سے ان کے شعری مسلک کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس مجموعہ کلام کا رسم اجرا ہمارے سابق وزیرِ اعظم آنجہانی شری پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں ۱۹۶۲ء میں عمل میں آیا تھا۔

۱۹۴۸ء حیدرآباد کی تاریخ میں جسطرح ایک عظیم انقلاب کا باعث ہوا۔ وحید کی زندگی میں بھی سنگ میل سے کم نہیں تھا۔ طبیعت کی افتاد کچھ ایسی تھی کہ انھیں مخصوص غذا پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ چکنی چکنی مرغن چیزوں سے ممکنہ پرہیز کرتے تھے۔ میوئے مٹھائیوں کے شوقین مولوی عبدالحق کی طرح وحید بھی میوے شوق سے کھاتے اور کھلاتے تھے۔ اکثر پیچش کی شکایت ہو جاتی تھی۔ ۱۹۴۸ء سے دمہ کا مرض بھی لاحق ہو گیا۔ خود اکثر کہا کرتے تھے۔ بلگرامیوں سے مجھے دو چیزیں تحفتاً ملی ہیں۔ ایک پیچش۔ دوسرا دمہ درحقیقت ان چیزوں کے ناورا اگر کوئی اور چیز وہاں سے ملی ہے تو وہ ہے دوستی۔

بلکہ ابتداؤں سے ان کی دستی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔
آخر تک برقرار رہی۔

دمے کے عارضے کے بعد انکی رہی سہی ایک
اور ذمہ داری بھی خاتون (ان کی اہلیہ) کے سرآپڑی
ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق انھیں گھر کی چھوٹی بڑی
ہر طرح کی الجھن سے دور رکھا گیا۔ اسکے باوجود شاعر
کی حساس طبیعت کب چین لینے دیتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء
میں خاتون کی خواہش پر انہوں نے پیش از وقت ملازمت
سے سبکدوشی حاصل کرلی۔ یوں کہیے۔ اس سلسلے میں
صرف خاتون کی خواہش ہی نہیں بلکہ وحید کا شاعرانہ
ذوق بھی کارفرما تھا۔ جو ان کو ملازمت کی پابندیوں
سے بے نیاز کرنا چاہتا تھا۔ انہوں نے اپنا قیمتی وقت
شعر و سخن کے گیسو سنوارنے کیلئے وقف کردیا۔ اسی
سال ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کیلئے
انجمن ترقی اردو ہند نے انھیں اپنا لائف ممبر اور مہاراشٹر
کی شاخ کا صدر منتخب کیا۔ ۲۶ جنوری ۱۹۶۵ء کو یوم جمہوریہ کا

تقریب میں انھیں صدر جمہوریہ نے پدم شری کے اعزاز
سے نوازا گیا۔ اور ۱۹۶۲ء میں وہ صوبۂ مہاراشٹر سے
راجیہ سبھا کے رکن بھی منتخب ہو گئے۔ اس زمانے
میں ان کا قیام ساؤتھ ایونیو نئی دہلی کے کوارٹر ۵۵
میں رہا۔ جو ان دنوں اکثر اردو شعراء و ادباء کا مہمان
خانہ بنا رہا۔ ڈاکٹر صفی الدین صدیقی رقم طراز ہیں:

"وہ اپنا زیادہ وقت پارلیمنٹ کی لائبریری
میں گزارتے تھے۔ اپنی پسند کی ایسی تمام
کتابیں انھوں نے پارلیمنٹ کی لائبریری
کیلئے منگوائی تھیں جن میں زر مبادلہ کی
دقتوں کے باعث دوسری عام لائبریریوں
کیلئے بالراست منگوانا ممکن نہیں تھا۔" [1]

تقریباً ۱۲ سال تک وہ راجیہ سبھا کے ممبر رہے۔ اور
اور اردو کیلئے برابر لڑتے رہے۔ یہ وہی زمانہ ہے
جبکہ پروفیسر نورالحسن مرکز میں وزیر تعلیمات تھے۔

---

[1] صفی الدین صدیقی۔ وحید شاعر و شخص مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ ۱۹۸۶ء

پروفیسر نورالحسن مرنجامرنج اور شریف النفس تو تھے ہی لیکن خاصے سست طبیعت کے مالک تھے۔ جب کبھی اردو کا مسئلہ سامنے آتا ٹال مٹول کر دیا کرتے۔ جس کا وجد کو بڑا ملال ہوتا۔ آخر انہوں نے ایک دفعہ پارلمنٹ میں یہ شعر تک سنا دیا۔

اردو کا حال کیا کہیں اہل وطن سے ہم
تنگ آ گئے ہیں سستیٔ نورالحسن سے ہم

دوستانہ مراسم کو برقرار رکھتے ہوئے غم و غصے کا بروقت اس سے اچھا اظہار شاید ہی کسی اور طریقہ سے ہو سکتا تھا۔ اس شعر میں طنز کا تیر بھی ہے۔ حقیقت کا بیان تو کبھی اور رنج کا اظہار بھی۔ وجد کی تنگ مزاجی یہ کب برداشت کر سکتی کہ اردو کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہو اور سابق منصف پارلمنٹ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔

مولانا آزاد تعلیمی سوسائٹی اورنگ آباد کب ایسے گوہر نایاب سے مستفید نہ ہوتی، جبکہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اورنگ آباد ہی میں سکونت

اختیار کی۔ اس سوسائٹی نے وحید کو اپنا وائس پریسیڈنٹ
بنالیا۔ ان فرائض کی انجام دہی کے دوران وحید نے
۱۹۷۷ء میں اپنا چوتھا شعری مجموعہ "بیاضِ مریم" طبع
کرایا۔ اور اسکی انفرادیت کو برقرار رکھنے اور اسکو
اسم بامسمیٰ بنانے کیلیئے مکمل مجموعہ کلام اپنے ہی قلم
سے لکھا۔ اسکا انتساب بھی اپنی ایک قدردان و رفیق
نواب مہدی یار جنگ کی صاحبزادی اور نقیب بلگرامی
کی اہلیہ مریم بلگرامی صاحبہ کے نام کیا۔ جو ان کی شخصیت کے
ساتھ ان کی تحریر کی بھی دلدادہ ہیں۔ اس مجموعہ کی ایک
اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف ایک نظم "حسین کی
تصویریں" کے علاوہ ساری تخلیقات اوراق مصور آفتاب
تازہ اور لہو ترنگ میں شامل نہیں۔ اس میں وحید کی
جدید و قدیم غزلوں اور نظموں کا ایک انوکھا امتزاج
ہے۔ اس کے پہلے حصے میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۷ء تک کا کلام
موجود ہے۔ جن میں ۱۴ منظومات اور ۱۸ غزلیات ہیں۔
اس مجموعہ کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ مجموعی طور پر یہ

پھر علاوہ علاوہ اس مجموعہ میں وحید کی غزلیات کی تعداد
منظومات کی بہ نسبت زیادہ ہے اس سے اس بات کا پتہ
چلتا ہے کہ وحید جو اپنے دوستوں میں "نظم لکھ دوں گا"
کا فقرہ کہتے تھے۔ غزل گوئی کی سمت مائل ہوئے۔
ان کی ان غزلوں میں بھی ایک طرح کی جدت نظر آتی ہے،
اس کے علاوہ اس مجموعہ میں دیگر شعرا کے چند اشعار
بھی شامل کئے گئے ہیں۔

بیاض مریم کی ایک اور خصوصیت یہ کہ اس میں وحید
کے اشعار پر بنائی گئی ہندوستان کے مایہ ناز آرٹسٹ
مقبول فدا حسین کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ یہ تصاویر
شاعر کے جذبات کو بے محابا واضح کرنے اور پنہاں نکات
کو بے لحاظ نمایاں کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اس اچھوتے
امتزاج کو جس میں مصوری اور شاعری دونوں پہلو بہ پہلو
چلتے ہیں اردو مجموعوں میں بہت کم دیکھا گیا
بیاض مریم پر اتر پردیش اردو اکیڈمی نے تین ہزار
روپئے کے انعام سے نوازا اور غالب انسٹیٹیوٹ

نئی دہلی نے سنہ ۱۹۷۷ء میں اس مجموعہ پر پانچ ہزار روپے
کا ایوارڈ عطا کیا۔

وحید سنہ ۱۹۷۱ء میں بہار اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کے وائس
چیرمین مقرر ہوئے انجمن ترقی اردو نے وحید کے انتخاب
کلام کا پانچواں ایڈیشن شائع کیا۔ جسمیں سنہ ۱۹۴۲ء سے
۱۹۷۵ء تک کا کلام ملتا ہے۔ یہ بڑا ہی مستند انتخاب
ہے۔ بیاض مریم کی اشاعت کے ساتھ ہی ان کی شاعری
کا اور زیادہ شہرہ ہونے لگا۔ وہ نقاد جو سکندر علی
وجد سے کم آشنا یا ان کی ادبی حیثیت کے قدرے کم
معترف تھے۔ اس مجموعہ کی تعریف کرنے لگے۔ ڈاکٹر
وحید اختر نے ہفتہ روزہ ہماری زبان یکم نومبر ۱۹۷۸ء
کے شمارہ میں ایک تبصرہ "بیاض مریم کا شاعر" کے زیر
عنوان لکھا جو سکندر علی وجد کی پوری شاعری کا احاطہ
کرتا ہے۔ وحید اختر کے بموجب۔

"اوراق مصور اور بیاض مریم کے
بالاستیعاب مطالعے نے مجھے انکی

شاعری کا معترف بنایا"۔ ؎۱

ڈاکٹر مغنی تبسم نے بھی ایک جامع تبصرہ "میصر"
حیدرآباد میں شائع کیا۔ اسی طرح سردار جعفری کا
تبصرہ بلٹز میں شائع ہوا ڈاکٹر سیدہ جعفر، اشفاق حسین
مرحوم، مسعود حسین خاں، اور شاذ تمکنت نے بھی
"بیاضِ مریم" پر تبصرے لکھے۔

۱۹۷۷ء میں جب وحید کے کلام کا انتخاب شائع
ہوا تو ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اس انتخاب پر ایک خاصا
طویل تبصرہ ہفتہ روزہ بلٹز ۱۳ ستمبر ۱۹۷۷ء میں تحریر
کیا۔ اس تبصرہ میں تنک مزاج اور نازک وضع قطع والے
وحید کے آبگینۂ دل کو ٹھیس پہنچانے والی بعض باتیں
بھی تھیں۔ ظ صاحب نے اوراقِ مصور کی اشاعت کے
بعد "وحید کا شعر" کے زیرِ عنوان ایک مضمون ماہنامہ
'صبا' حیدرآباد دسمبر ۱۹۶۳ء میں لکھا تھا۔ انداز تو وہی

؎۱ وحید اختر "وحید صاحب کچھ یادیں کچھ باتیں" وحید شاعر و
شخص" مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ ۱۹۸۶ء

تھا جو کہ بلٹز کے مضمون کا تھا۔ لیکن یہ تحریریں بہرحال
ایک دو جگہوں پر مختلف ضرور ہیں۔ وحید نے ظ آ صاحب
کی رائے کو "جو کچھ پاتے نہیں وہ عیب اکثر ڈھونڈ لیتے
ہیں" کے مصداق سمجھا اس کا راست جواب دینا
وحید جیسی باوقار بزرگ شخصیت کے بس کی بات نہیں تھی
لیکن وہ تبصرہ نگار کا جواب دینا بھی چاہتے تھے۔ چنانچہ
ایک نظم جو دراصل تحسین ناشناس کے زیر عنوان
۱۹۴۵ء میں کہی گئی تھی۔ اور جس کو ترمیم و اضافہ
کے ساتھ "اوراق مصور" میں بھی شامل کیا گیا تھا۔
مزید چند اشعار کا اضافہ کرنے کے بعد ہفتہ روزہ
بلٹز ہی میں شائع کروایا اور لکھا گیا کہ یہ نظم تبصرہ نگار
کے ہر سوال کا جواب ہے۔ یہی ہجویہ نظم روزنامہ
سیاست حیدرآباد ۲۴ رمئی ۱۹۸۲ء میں بھی شائع
ہوئی۔

سکندر علی وجد نے علمی و ادبی دنیا میں اپنی صلاحیتوں
سے مکمل کام لیا۔ جنوری ۱۹۶۰ء میں انجمن ترقی اردو

اورنگ آباد کی شاخ دوبارہ تشکیل پائی اور ایک نئی
ایڈہاک کمیٹی اور مجلس مشاورت کی تنظیم عمل میں آئی
تو وحید کو اسکا صدر منتخب کیا گیا۔ جن کی نگہداری میں
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد اپنی کارکردگی میں مصروف تھی
سکندر علی وجد بحیثیت صدر پہلی خواہش یہ ظاہر کی تھی
کہ مقامی مدارس اور کالجوں میں امتیازی تشانات حاصل
کرنے والے طلبا و طالبات کو بابائے اردو" مولوی عبدالحق
انعامات" سے نوازا جائے۔ اس فرمائش کا احترام کرتے
ہوئے انجمن نے اس کی تعمیل میں مسرت محسوس کی تھی
اسکے علاوہ وحید نے اردو کی ترقی اور فلاح و بہبودی
کیلئے انجمن کو اپنے گراں بہا مشوروں سے مستفیض
ہونے کا زریں موقع فراہم کیا تھا۔

حکومت مہاراشٹر نے مارچ ۱۹۷۵ء میں ایک
قرارداد کے ذریعہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکیڈیمی
کو تحلیل کرکے نئے بورڈ آف گورنرس کی تشکیل کی۔
اس کے نو منتخب نمائندوں میں سکندر علی وجد بھی تھے

نومبر ۱۹۸۱ء میں ترقی اردو بورڈ کا دوسالہ چھٹا
انتخاب ہوا۔ تو وحید کو اس بورڈ کا وائس چیرمین
نامزد کیا گیا۔ ان سے پیشتر آل احمد سرور اس عہدے
پر فائز تھے۔

ترقی اردو بورڈ کی گیارھویں میٹنگ ۱۹ دسمبر
۱۹۸۱ء کو شاستری بھون میں منعقد ہوئی۔ اس
میٹنگ میں وحید نے خرابی طبیعت کی وجہ سے شرکت
نہیں کی البتہ جون ۱۹۸۲ء میں منعقدہ میٹنگ میں وہ
شریک رہے۔ یہی پہلی اور آخری میٹنگ تھی جس میں
وحید نے شرکت کی۔

وحید کی ادبی خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے
مولانا آزاد کالج اورنگ آباد کی جانب سے دوروزہ
جشن وحید ۱۱ر اور ۱۲ر دسمبر ۱۹۸۲ء کو منعقد ہوا۔
اس جشن کی افتتاحی تقریب مولانا آزاد کالج کے اوپن
ائیر تھیٹر میں ۱۱ر دسمبر کو شام کے پانچ بجے منعقد
ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر رفیق ذکریا (سابق ایم۔پی) نے

انجام دی۔ اور مرٹھواڑہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر
مسٹر گوبند راؤ مہیسکر نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے
شرکت کی اور انھیں کے ہاتھوں جشن وحید کے سلسلے
میں شائع کردہ سوینیر کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ مولانا
آزاد کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مظہر محی الدین کے استقبالیہ
تقریر کے بعد خواجہ عبدالغفور، انمنت بھالے راؤ، قاضی سلیم
اور ڈاکٹر اے اے ملکی نے اپنی تقاریر کے ذریعہ وحید کی
شخصیت اور ان کے فن کو خراج عقیدت پیش کیا
مولانا آزاد کالج اورنگ آباد کی جانب سے وحید کی
عقیدت میں -/10000 دس ہزار روپیے کا کیسہ زر
پیش کیا گیا۔ مہاراشٹر اردو اکیڈیمی نے بھی پانچ
ہزار کا چیک پیش کیا۔ جی۔ آر۔ مہیسکر وائس چانسلر
نے اپنا تقریر کے بعد یونیورسٹی کی جانب سے بھی
5000 پانچ ہزار کا کیسہ زر کا اعلان کیا۔ وحید کی مجبور
طبیعت اور فارغ البالی طبیعت نے انھیں مولانا
آزاد کالج کی جانب سے پیش کردہ 10000 دس ہزار

روپیے کا کلیتہ نادار طلبہ ہی کی امداد کے لیئے دے دیا۔
مرٹھواڑہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جی۔ آر۔ مہیسکر نے
وحید کو ڈی لٹ کی سند کے لیئے وحید کا Biodata
حاصل کیا۔ ڈاکٹر عبید سیبار کے بموجب یہ سند آئندہ
کانوکیشن کے موقع پر دی جانے والی تھی۔
جشن وحید کی اس تقریب کے ساتھ ہی وحید کی
منظومات اجنتا، ایلورا کو پردۂ فلم پر پیش کیا گیا۔
اور ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ دوسرے دن وحید کی
۵۰ سالہ ادبی خدمات کو پیش نظر رکھ کر "وحید کی شخصیت
اور خدمات" موضوع پر ہندو چیا ٹکنالوجیکل انسٹیٹیوٹ
کی عمارت میں صبح ۱۰ بجے سے سیمینار شروع ہوا
جسکی صدارت کے فرائض قاضی سلیم نے انجام دیئے
خواجہ عبدالغفور کی تقریر کے بعد سیمینار کا آغاز
ہوا۔ جس میں ڈاکٹر سیدہ جعفر، جیلانی بانو، ڈاکٹر انور
معظم اور ڈاکٹر عصمت جاوید نے اپنے مقالے پیش
کیئے۔ ان کے علاوہ یوسف ناظم نے ایک مزاحیہ مضمون

کے ذریعہ وحید کی شخصیت کی نقاب کشائی کی۔

وہ فضا! فضائے اورنگ آباد جو اورنگ آباد دکن ہے۔ جہاں وحید نے اپنی جوانی کے نغمے الاپے تھے۔ انہیں بڑی دلآویز تھی۔ اس شہر کی فرقت وحید کو کبھی گوارا نہیں تھی۔ جب وہ حیدرآباد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آئے تو انکو اورنگ آباد کی جدائی کا غم بہرحال رہا۔ انہی دنوں میں "غریب الوطنی" عنوان کے تحت انہوں نے ایک نظم لکھی۔ جس میں فرقت کے درد کو کئی بندوں میں پیش کیا گیا ہے۔

تنہائی مصیبت ہے سفر میں
جو آگ اٹھتی ہے دل میں تو کبھی درد جگر میں
رہتا ہے جہاں تیرہ و تاریک نظر میں
ہر سانس پہ شعلے سے بھڑک اٹھتے ہیں سر میں

دم بھر کیلئے یاس کی گردن نہیں جھکتی
سونے میں کبھی شکوؤں کی رفتار نہیں رکتی

کیا وقت ہے کہ اورنگ آباد کو دو پہنچے ہو کے

عاشق نصیب ہوئے ایک اورنگزیب عالمگیر اور دوسرے مولوی عبدالحق جنہوں نے اپنے مقام کو ترک کرتے ہوئے اس جا پہ پہنچکوں کو اپنا قیام گاہ بنایا۔ اس لحاظ سے سکندر علی وجد بھی اورنگ آباد کے شیدا رہے۔ اپنا پیدائشی مقام ویجاپور ترک کرکے اس مقام کو انہوں نے اپنایا اور دل سے چاہا چنانچہ وجد کو شامل کرتے ہوئے ہم اس کہاوت کو ایسا بنالیں تو بے جا نہ ہوگا کہ اورنگ آباد کو تین پہنچے ہوئے عاشق نصیب ہوئے جنہوں نے اپنی عمر کا ایک دور اس کی ناز برداری میں صرف کیا۔ مرتوں اسکے گیسو سنوارتے رہے۔ اور اسی کے دامن سدمال میں محو خواب ہیں۔

اورنگ آباد چونکہ فنون لطیفہ کا مرکز ہے۔ اس ماحول میں پرورش پاکر وجد کی شخصیت فنون لطیفہ کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں ڈھل گئی تھی۔ ان کے اشعار میں ان کیفیات کو جا بجا محسوس کیا جا سکتا ہے

سے بہار ہستی اب مجسم سوز ہونے دے مجھے

ٹھہر جا اے وقت لطف اندوز ہونے دے مجھے

محبت کے فرشتے گوہر آواز ہوتے ہیں

اس ارضِ پاک پر حسن اور نغمہ مل کے بستے ہیں

تخیل پر میرے منقوش ہے تیری بہار اب تک

یہ آنسو تیری الفت کے ہیں؟ یہ تنہ دار اب تک

وحید سے ملاقات اور تبادلۂ خیال کے لئے راقم الحروف نے مئی یون، ۱۹۶۷ء میں اورنگ آباد جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ حیدرآباد پہنچنے پر اطلاع ملی کہ وحید ترقی اردو بورڈ کی میٹنگ میں شرکت کی غرض سے دہلی جا رہے ہیں اور واپسی میں ان کا بمبئی ہی میں کچھ دن قیام رہے گا۔ بادل ناخواستہ اورنگ آباد کا سفر ملتوی کرنا پڑا۔ سوچا کہ جشن وحید کے موقع پر ہی کیوں نہ چلی جاؤں۔ لیکن یہ بھی شاید خدا کو منظور نہیں تھا۔ جشن وحید ٹھیک اسوقت منعقد ہوا۔ جبکہ ام۔فل کے تحریری امتحانات کوئی دو تین دن

باقی تھے۔ یعنی ۱۱ اور ۱۲ دسمبر کو اور امتحان ۱۶
اور ۱۷ دسمبر کو ہونے والا تھا۔ اس سے بھی عجیب
بات تو یہ رہی کہ یہاں کے اخباروں نے جشن وحید کی
قبل از جشن کوئی اطلاع بھی نہیں دی۔ لہٰذا دو حسین
اتفاقات سے مجھے ہاتھ دھونا پڑا۔ جب آٹھ اپریل کے
ہفتہ روزہ ہماری زبان پرچہ میں وحید کی علالت کی خبر
شائع ہوئی تو وحید سے ملنے کی دیرینہ خواہش نے پھر
سے ایک بار انگڑائی لی۔ اور ۱۹۸۳ء میں اگر ان سے ملنے
کا موقع بھی ملا تو ایسے وقت جبکہ وحید خود فریش
ہوچکے تھے۔ بات چیت کے تو کئی دن پہلے ہی سے
قابل نہیں تھے۔ جب ہم ۲۱ اپریل کو ۲ ½ ڈھائی بجے
کے قریب ان کے مکان پہنچے تو وہاں انکے نسبتی برادر
محمد شفیع اور کئی دوسرے اقارب موجود تھے۔ پتہ چلا کہ
بیگم زبیدہ خاتون (زوجہ وحید) ہاسپٹل ہی میں رہتی ہیں
تھوڑی دیر بعد وحید کے اعزا کے ساتھ ہم نے گھاٹی
میڈیکل ہاسپٹل کا رخ کیا۔ وحید ہاسپٹل میں مردانہ وارڈ

ہسپتال میں زیرِ علاج تھے۔ وہاں کے ڈاکٹر
یس۔ نواز طالب صاحب کا خیال تھا کہ دماغ کی رگیں سکیڑنے
کی وجہ سے خون دماغ تک نہیں پہنچ رہا ہے۔ یہی وجہ
تھی کہ وہ بات چیت کے قابل نہیں تھے۔ ہاسپٹل میں
زبیدہ خاتون صاحبہ کے علاوہ وحید کی بہن اور برادرزادہ
اشرف علی صاحب بھی موجود تھے۔ حسن شاکر صاحب
(وحید کے متبنیٰ) جو محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے ہیں
ان سے بھی وہیں ملاقات ہوئی۔ وقت وہی کوئی ۱/۲ ۲
کے قریب تھا۔ وحید کو بخار آگیا تھا۔ اور تھوڑی ہی
دیر میں پسینہ پانی کی طرح بہنے لگا۔ پنڈا بالکل ٹھنڈا
محسوس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر پل پل کی خبر لینے آتے
انجکشنوں کا سلسلہ جاری تھا۔ پلنگ کی ایک طرف
سلائن اسٹانڈ پر گلوکوز کی بوتل لٹکی ہوئی تھی۔ جس
کے پائپ کا نازل ان کے بازو میں لگا ہوا تھا۔ اور دوسری
جانب اسٹانڈ پر رقیق غذا کی بوتل لگی تھی۔ جس کے پائپ
کے ذریعہ ناک معدہ تک پہنچایا گیا تھا۔ مختلف ادویات

استعمال سے کیمیائی عمل، ردعمل کے نتیجے میں ان کے بدن پر زخم سے آگئے تھے۔ اور پاؤں سوج گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے انھیں جسم پر کوئی اختیار ہی نہیں تھا۔ سبز آنکھیں قریب قریب پتھرائی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ حیات و ممات کے مابین ایک عجیب و غریب کشمکش جاری تھی۔ اسکے باوجود وحید کی شخصیت کا پرتو یہاں بھی جھلکنے لگتا ہے۔ جب کوئی ناگوار بات پیش آجاتی تو چہرے سے ناگواری کا اظہار کر دیتے۔ یا پھر ایک آدھ جملہ بمشکل ادا ہو جاتا جو تو دانکے ایک قریب ترین خادم عزیز میاں کی سمجھ میں آتا اور وہ فوراً اسکے تدارک میں لگ جاتے چار دن قریب سے دیکھنے کے باوجود مجھے اطمینان تو خیر نہیں ہوا۔ البتہ ان کی بعض ایسی باتوں کا کما حقہ علم ہوا جو دسترس سے باہر تھیں۔ بیگم وحید نے اپنی مصروفیات اور ذہنی دباؤ کے باوجود پورا پورا تعاون کیا۔ ۲۴ر اپریل کی رات کو جب ہم نے واپسی کا ارادہ کیا اور اسٹیشن پہنچے تو ذہن میں

ایک سوال گونجنے لگا۔ آیا اورنگ آباد کا سفر کامیاب رہا؟ مجھے اس کا جواب آج تک نفی میں ہی ملتا رہا۔ کامیاب اسی وقت کہلاتا ہے جبکہ وحید سے ادبی موضوعات پر بحث ہوتی ان سے باضابطہ ملاقات ہوتی اصناف سخن پر ان کے خیالات سے مستفیض ہوتی۔

واپسی کے بعد میں پوری طرح متوجہ بھی نہیں ہو پائی تھی اور شخصیت کا باب ابھی مکمل بھی ہونے نہ پایا تھا کہ ارتحال وحید کی اندوہناک خبر ملی چارو ناچار بادلِ ناخواستہ ان الفاظ کو ترتیب دینا پڑا۔ کہ وحید نے گیارہ ماہ کی طویل علالت کے بعد اورنگ آباد کے میڈیکل ہاسپٹل میں دوشنبہ ۱۶ مئی ۱۹۸۳ء کی صبح کو بعارضۂ قلب اس دنیائے رنگ و بو سے کوچ کیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اور اسی شام ۲/۱ ۸ بجے ٹاؤن ہال کے قریب واقع حضرت حضوری شاہؒ کی درگاہ کے احاطے میں وحید کا جسد سپرد خاک کیا گیا۔

وجد کی نظم نگاری

علی گڑھ تحریک، آزاد، حالی اور شبلی وغیرہ کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بیسویں صدی کے آغاز سے اردو نظم نگاری کو فروغ حاصل ہونے لگا۔ آزادی کی جدوجہد نے بھی نظم نگاری کو وسعت دینے میں اہم حصہ ادا کیا۔ مغربی شعر و ادب سے واقفیت نے گویا سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ انیسویں صدی سے ہمیں جو شعری و ادبی ورثہ ملا وہ نئی نئی راہوں پر گامزن ہونے کیلئے زادِ راہ بن گیا۔ جس سے استفادہ کر کے اردو شاعروں نے اپنا ایک الگ اور منفرد مقام حاصل کیا۔ روایت سے بغاوت کے چراغ جلائے گئے۔ جن کی ملی جلی روشنی اردو کے شعراء کو ذی شعور بنانے میں مفید ثابت ہوئی۔ ۱۹۲۲ء کے لگ بھگ جب کہ وجد نے شعر گوئی کا آغاز کیا

اردو شاعری کے افق پر اکبرالہ آبادی، اقبال، نظم طباطبائی محسن کاکوری، سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری جیسے شاعر نظم نگاری کے افق پر چھائے ہوئے تھے تو غزل نگاروں میں حسرت، فراق، جگر، فانی اور اصغر امتیازی مقام کے حامل تھے۔ ترقی پسند تحریک کو شروع ہوتے ہیں زیادہ عرصہ نہیں رہ گیا تھا۔ بلکہ وہ شاعر جو آگے چل کر ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے معروف ہوگئے۔ اس وقت اپنی شاعری کی کئی منزلیں طے کرچکے تھے۔ جنہوں نے حالی اور ان کے رفقاء کے بعد نظم نگاری کی توسیع میں معتدبہ کردار ادا کیا تھا فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، جانثار اختر علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین اور قتیل شفائی سپہر شعر وادب پر نمودار ہوچکے تھے۔ ترقی پسندوں کے غزل سے احتراز نے بیشتر شعراء کو نظم نگاری کی طرف متوجہ کیا۔ جسکی وجہ سے ادب اور زندگی، ادب اور سماج، ادب اور سیاست، ادب اور انسانیت کے

رشتے مضبوط ہونے لگے۔ لہٰذا ادب اور سیاست کا جو
نرالا اور خوشنما امتزاج وجود میں آیا وہ عرفی پسندوں
کا منفرد وصف ہونے کے علاوہ تقاضائے وقت بھی تھا۔
اب شاعری کی زندگی سے وابستگی نے اسکو ہمہ جہتی
ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ بقول شخصے شاعری اور زندگی
اب ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ شاعری اب نہ صرف غلامی
و آزادی کی حکایت تھی بلکہ حکومت برطانیہ کے ظلم و
تشدد، جبر و استبداد کے خلاف، سرمایہ داری کی عفونت
اور انگریزی حکومت کی پھیلائی گئی عفونت کے انسداد
کے لئے بھی سینہ سپر تھی۔ اس طرح شاعری کی زندگی
کے عصری مسائل میں افادیت کو تسلیم کر لیا گیا۔
خلوص، ہمدردی، رفعت و بلندی، صداقت و حقانیت
غرض اب شاعری تمام خصوصیات کی حامل تھی۔
اقبال نے وقت اور ضرورت کو پیش نظر رکھ کر
ملی و قومی منظومات کا آغاز کیا۔ یوں بھی حالی کی "مد و
جزر اسلام" اپنی طرز میں شاہکار نمونہ موجود تھی۔ لیکن

اس میں جو خطیبانہ انداز و آہنگ ہے وہ گوش کو کبھی کبھی گوارا نہیں گذرتا۔ حالی نے اپنی تخلیق میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے قوم کی پستی و بلندی کو روشناس کیا تھا۔ گویا انہوں نے قوم کو اسکے مزاج سے آگاہ کیا۔ بالفاظ دیگر حالی نے قوم کے مرض کی صرف تشخیص کی جبکہ اقبال نے اس مرض کیلئے نسخہ بھی تجویز کیا۔ نظم نگاری جو صرف نعرہ بازی کے حصاروں میں مقید ہو چکی تھی۔ اب تغزل کے روشن افق پہ آگئی ہے۔ انہوں نے نئے نئے علامتوں کا انتخاب کیا۔ الفاظ کے معنوی پیکر بدل ڈالے اور انکو نئے ظروف میں ڈھالا۔ مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید سے اردو نظم نگاری میں جو کوتاہیاں در آئی تھیں انہوں نے انکے تدارک کی بھی سعی کی۔ اکبر الہ آبادی نے بھی مغربی معاشر کی پھیلائی گئی عفونت کے خلاف نعرۂ احتجاج بلند کیا تھا۔ جوش ملیح آبادی نے نظم نگاری کو شبابیات کے علاوہ انقلاب آور رجحانات سے بھی روشناس کروایا۔ اور مملکت کی آزادی کے نغمے گائے۔ اس طرح آزادی کا

خواب دیکھنے والوں میں چکبست بھی شامل تھے۔ جنہوں نے
ہندوستانیوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے ان کی
ترجمانی و نمائندگی کی۔ اختر شیرانی نے اردو نظم نگاری
کو ایک نئے موڑ پر لے آیا۔ انھوں نے اردو میں سانیٹ
نگاری کو فروغ دینے میں کما حقہ حصہ ادا کیا اور اسکے علاوہ
رومانیت کو بھی اردو شاعری سے ہم آہنگ کیا۔ رومانی
منظومات کو اختیار کرنے والوں میں اسرار الحق مجاز، حفیظ
جالندھری، اور اختر انصاری بھی شامل ہیں۔ ان کے
ہاں دوسرے لوازمات کے ساتھ ساتھ رومانی تصورات
کی کارفرمائی بھی ملتی ہے۔ اس عہد کے بیشتر شعراء مقصدی
منظومات لکھتے رہے۔ ان کا مطمح نظر سماجی اصلاح تھا۔
ان کا انداز بیان بھی اسی لحاظ سے سیدھا سادھا عموماً
از دل ریزد، بر دل خیزد، کے مصداق معلوم ہوتا تھا۔
ہوتے ہوئے بعض شعراء میں ایک طرح کی سطحیت سی
آ گئی۔ اسی پس منظر میں کئی شعراء کی تربیت ہوئی جو
آگے چل کر کئی گروہوں میں بٹ گئے۔

"۔۔۔ شاعر کی تخلیقی شخصیت اپنے گرد و پیش

کی مہک ضرور رکھتی ہے۔ خواہ فن میں اس

کا اظہار منفی انداز میں ہو یا مثبت طور پر"[1]

سکندر علی وجد کی شاعری کی ابتدا بھی چونکہ اسی پس منظر

میں ہوئی تھی۔ انہوں نے غزل کو اپنانے کے ساتھ نظم کی طرف بھی

توجہ دی۔ ان کی ابتدائی شاعری میں متذکرہ بالا شاعر کی آواز

ملتی ہے۔ میر انیس کے مرثیوں سے ان کا شغف اسی طرز کے

مسدس لکھنے پر آمادہ کیا۔ ان کی شاعری میں حالی کا خطیبانہ

انداز، اقبال کا سوز و گداز، جوش کا نعرۂ انقلاب، اختر

شیرانی اور حفیظ کی رومانیت غرض ہر چیز شروع سے ہی

قرینے سے بھی دیکھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی ابتدائی

منظومات اورنگ آباد کے انٹرمیڈیٹ کالج کے میگزین

"نورس" میں انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالہ" اردو"

کے شماروں میں شائع ہوتی رہیں۔ اس طرح انھیں ابتدا

ہی سے ہندوستان گیر شہرت حاصل ہوئی۔ غزل سے اپنی

---

[1] ڈاکٹر سید تبسم" وجد کی نظم" وجد شاعر اور شخص" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۴ء

شاعری کی ابتدا کرنے والے اس شاعر کو اکثر نظم ہی لکھنے کا خیال آتا تھا۔ یہ ان کی طالب علمی کے دور کی بات ہے۔ کہ اکثر جب کسی پر کچھ خفا ہوتے تو کہہ دیتے "بیٹا نظم لکھ دوں گا۔" ان کا یہ خیال تادم زیست باقی رہا۔ جب انھوں نے شاعری ترک کر دی تو سوچا کہ اس عنوان پر ایک مضمون لکھا جائے لیکن ساتھ ہی انکی طبیعت کی افتاد نے انھیں نظم کی طرف متوجہ کیا۔ ایک مکتوب مورخہ ۲۴ رمئی ۱۹۸۲ء بنام جناب عابد علی خاں مدیر روزنامہ سیاست میں لکھتے ہیں:

"میں "ترک شاعری" پر ایک مضمون بھیجنا چاہتا تھا۔ پھر خیال آیا اس عنوان پر ایک نظم ہونی چاہیے۔"

اس کے علاوہ ایک مکتوب بنام مریم بلگرامی مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۲ء میں یوں رقم طراز ہیں:

"میں نے دو سال سے شاعری ترک کر دی ہے۔ جو دیکھا تو یہ کبھی دلوانہ پن تھا۔"

نظم سے انکی خصوصی دلچسپی انھیں آگے چل کر ابتدا ا[illegible]

تاج محل، کاروانِ زندگی، مزدوروں کا پیغام، جیسی کئی مایۂ ناز شاہکاروں کی تخلیق کا باعث ہوئی۔ اورنگ آباد کا روح پرور ماحول، وہاں کے تاریخی مقامات، خوش منظر قلعے، یادگار کھنڈر جن سے ماضی کی کئی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ یہ سب چیزیں ان کی نظم نگاری کی محرک ہوئیں صدیوں کی تہذیبی وارداتیں، تاریخی عمارتیں نامور شخصیتیں ان کے موضوعات تھے اور ان کی شاعری کو مزین و مبسوط بنانے میں نمایاں حصہ ادا کیا۔

وحید ابتدا ہی سے بندھے ٹکے قوانین کے پابند اسلاف کے پیرو کلاسکیت کے علمبردار اور روایت کے طرفدار رہے ہیں۔ لہٰذا ان کی منظومات میں نہ کوئی ایسی نمایاں تبدیلی رونما ہوئی اور نہ کوئی ہیئتی تجربہ ہی وہ کر سکے۔ ان کی منظومات کی ابتدا ترقی پسندوں کے نظم پرور عہد میں ہونے کے باوجود اوصاف ترقی پسندی سے بری معلوم ہوتی تھیں وحید نے اپنی شاعری کو زندگی کے علاوہ انسان کی عظمت و رفعت اسکی ہمہ جہتی ترقی و ترویج، ہندوستان کی تاریخی

وسیاسی حالات اور یہاں کے فنون لطیفہ سے وابستہ
کر دیا۔ اوراق مصور کے دیباچہ میں اس کی وضاحت
کی ہے کہ یہی وہ چیزیں ہیں جن سے ان کی شاعری
طاقت اور حسن حاصل کرتی رہی۔" اسکے علاوہ ان کی
منظومات میں عصری آگہی اور عصری حسیت کا شعور بھی
ملتا ہے۔ جو ادبی محاسن، زندگی کے مسائل اور شعری
لطافتوں کے امتزاج سے ایک مفید معجون کی صورت اختیار
کر گیا ہے۔ اسکے ساتھ ہی ان کا فنون لطیفہ سے شغف
شاعری کیلئے سونے پر سہاگہ سے کم نہیں۔ وحید کی
منظومات زندگی کے حقائق کی صحتمند عکاسی کرتی ہیں
موضوعات کے اعتبار سے ان کی منظومات کو مختلف
زمروں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ جن میں تاریخی، شخصی،
قومی، تمدنی و ثقافتی منظومات اہم ہیں۔ وحید کی بیشتر
منظومات یا تو مسدس کی شکل میں ہیں یا پھر مخمس کی
صورت میں۔ انھوں نے کبھی ترجیع بند لکھے ہیں۔ اور کبھی
ترکیب بند۔ بعض منظومات جیسے "گہوارۂ مسیح" "نیلی ناگن

اور قاصد مثنوی ہیں۔ جن کے ہر بند میں اشعار کی تعداد مختلف ہے۔ "آہستہ گذر" اور "کی ہیم" کے ہر بند میں چار چار مصرعے ہیں۔ بعض منظومات مثنوی کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ جو طویل بھی ہیں اور مختصر بھی، اور اکثر غزل کے فارم میں لکھی گئی ہیں۔ اور تغزل کی پوری نمائندگی کرتی ہیں۔ ان منظومات کا ظاہری و معنوی حسن دونوں غزل سے میل کھاتے ہیں۔ ایسی منظومات میں خیال کا تسلسل بھی ہے اور غزل کی سی کیفیت بھی۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری لکھتے ہیں۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وحید نظم کے معنوی حسن کی تشکیل کی طرف سے پوری توجہ نہیں کر... وہ کسی مربوط تجربے کو پیش نہیں کرتے ان کی نظمیں عموماً تغزل کا انداز رکھتی ہیں۔ ان میں ہر شعر ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔"[1]

---

[1] ڈاکٹر حامدی کاشمیری "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" مجلس اشاعت ادب دہلی، ۱۹۶۸ء۔

گویا وحید نے نظم میں غزل کا رنگ و آہنگ شامل کر کے معنوی اور صوری دونوں پہلوؤں سے اس کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ خصوصاً ایسی منظومات میں جن میں ردیف و قافیہ کی پابندی ملتی ہے۔ غزل کا رنگ بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کا ہر شعر غزل کے شعر کی طرح جدا گانہ اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتا ہے۔ اور اس کے علاوہ شعریت و تغزل جو غزل کی جان ہے ان کی منظومات میں بالعموم جاری و ساری ہے۔ ایک کیف و سرشاری کی صورت میں۔

وحید نے بیشتر منظومات ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیات پر لکھی ہیں۔ جو تاریخی بھی ہیں اور سیاسی بھی۔ گویا وحید کی شاعری ہندوستان کے مدبر حکمرانوں، جانباز و جیالے سپاہیوں پُر عزم و بلند ہمت مجاہدین قوم، شہیدان وطن، سیاسی لیڈروں سے مانوس ہے۔ انھوں نے بعنوان "عبدالرزاق لاری" سلطنت قطب شاہی کے جانباز سپاہی پر چند بندوں پر

مشتمل ایک مسدس لکھی ہے۔ جس میں اس کی بہادری و وطن پرستی کو ملحوظ رکھا گیا اور اسکی وفاشعاری کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ عبدالرزاق لاری بہت سے زخم کھانے کے بعد بھی بڑی جوانمردی سے لڑتا رہا یہاں تک کہ بے ہوش ہو گیا۔ اس نظم کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ عبدالرزاق لاری کے کردار کو وجد نے زیادہ پر شکوہ اور زیادہ متاثر کرنے والے کردار کے روپ میں پیش کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ افسانوی تخیل و شعری مبالغہ کا دخل نہ ہو۔ اس نظم کا ہر بند بلکہ ہر مصرع تاریخی صداقت کا حامل اور مظہر ہے۔ اس نظم کا فارم اور لہجہ دونوں میرانیس کے مراثی سے ملتے ہیں۔ یہ نظم وجد کی ابتدائی منظومات میں بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ لیکن معنویت اور تاریخیت سے بھرپور ہے۔ اس نظم میں رزمیہ تشبیہات Epic similies بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ بند ملاحظہ ہوں ؎

شمشیر دکن تو نے عجب دھاک بٹھا دی
دشمن کو شب گور کی تصویر دکھا دی

اے مرد خدا قدر وفا تو نے بڑھا دی
قربان ترے مالک کیلئے جان لڑا دی

جب تک یہ نظام سحر و شام رہے گا
تاریخ دلیراں میں ترا نام رہے گا

فضیل جعفری وحید کی اس نظم کے بارے میں بجا طور پر لکھا ہے کہ دراصل یہ :

"صرف لاری کی ہی نہیں بلکہ جذبۂ وفاداری اور اظہار شجاعت جیسی اقدار کی تعریف ہے" [1]

اس کے علاوہ 'چاند سلطانہ' بھی اسی قبیل کی معرکۃ الآرا نظم ہے جس میں سلطنت نظام شاہی کی آخری ملکہ چاند سلطانہ کی بلند ہمتی اور بہادری کو بڑی خوبی سے نظم کیا گیا ہے۔ ظ انصاری نے لکھا ہے :

---

[1] فضیل جعفری، 'قلندر علی وحید کی تین نظمیں'، "وحید شاعر اور شخص"، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۹۸۷ء

وحید کی شاعری سے دکن کی اس عظیم تاریخی
عمارتوں اور شخصیتوں کا تصور وابستہ ہوگیا ہے۔
کون وحید؟ وہی اجنتا، ایلورا والے وحید
حیدرآبادی" [1]

اس سلسلے میں وحید کی جو اور منظومات مشہور ہیں۔ ان میں چکبست، محمد علی، مہاتما، مہاراجہ کشن پرشاد، اقبال، نظیر اکبرآبادی، ولی اورنگ آبادی، جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی، پروین سلطانہ، نغمے کی موت، مارلن منرو، حضرت زربخش رح، طیبہ، رقاصہ، حسین کا آرٹ، والد مرحوم، شیخ چاند، اور اشفاق کے نام پیش ہیں۔ وحید نے ان ساری منظومات میں متعلقہ افراد کے شخصی اوصاف کو نمایاں کرتے ہوئے ان کی قومی، ملی اور فنی خدمات پر بھی ہنرمندی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور ایسا بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے کہ اردو ادب میں ہمیشہ یادگار رکھا جائے گا۔

اقبال، نظیر اکبرآبادی، ولی اورنگ آبادی، منظومات میں

---

[1] انصاری، "وحید کا شعر"، صبا، ماہنامہ حیدرآباد دسمبر ۱۹۶۳ء

وحید ان اشخاص کی شاعرانہ صلاحیت سے متاثر نظر آتے ہیں[121]
جبکہ چکبست کو ان کی شعری خدمات کے علاوہ مجاہد آزادی
کی حیثیت سے بھی یاد کیا ہے۔ جب کہ نظم 'محمد علی' میں
محمد علی ایک سچے مجاہد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں نظم
'محمد علی' کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

نفرت ازلی تھی تجھے دینار و درم سے
جھپکی نہ کبھی آنکھ تری جاہ و حشم سے
سر جھک نہ سکا سطوت اسکندر و جم سے
بجلی تھی زبان آگ برستی تھی قلم سے

تحریر سے تھا رنگ عیاں قلب تپاں کا
تقریر میں تھا سوز مجاہد کی اذاں کا

وحید کی نظم 'مہاراجہ کرشن پرشاد' نہ صرف مہاراجہ
موصوف کی توصیف میں لکھی گئی ہے۔ بلکہ ایک علامت
ہے جو اس دور کے حیدرآبادی تہذیب کی نمائندگی کرتا
ہے۔ جس میں ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کا عروج نظر آتا
ہے۔ پروفیسر زینت ساجدہ کے الفاظ ہیں:

" مہاراجہ حیدرآباد کی تہذیب و شائستگی کا
کا نمونہ مشرقی روایات کا زندہ پیکر ہندو
مسلم اتحاد کے علمبردار جود و سخا کا
مجسمہ تھے۔ ان کی ذات بجائے خود ایک
روایت ایک انجمن اور ایک عہد تھی"۔ ؎۱

وحید کی اس نظم کا ہر بند مہاراجہ کی فطرت کا آئینہ دار ہے۔
ایک بند ملاحظہ ہو۔؎

فیض پاتا ہے تری بزم سے ہر صاحبِ فن
لطف سے تیرے سرفراز ہیں اربابِ فن
فخر کرتے ہیں تری ذات پہ ابنائے دکن
قوم کہتی ہے تجھے غازیِ تفریق شکن
دیکھ اب تنگ چمن رنگ رواداری ہے
پھول خاموش ہیں تسلیم ستم جاری ہے

پروفیسر مغنی تبسم نے مہاراجہ کرشن پرشاد کے اوصافِ حمیدہ

؎۱ زینت ساجدہ "حیدرآباد کے ادیب" آندھرا پردیش
ساہتیہ اکاڈیمی حیدرآباد اگست ۱۹۶۲ء

کو ان الفاظ میں سراہا ہے۔

"مہاراجہ کرشن پرشاد کی ذات سخاوت
علم دوستی تہذیب و شائستگی اور حسنِ
اخلاق کا بے مثال نمونہ تھی۔ شعر و سخن
سے دلچسپی انہیں اپنے نانا مہاراجہ چندو لال
شاداںؔ سے ورثہ میں ملی تھی انھیں عالموں
اور شاعروں کی صحبت عزیز تھی اور وہ ان کی
دلجوئی اور خاطر داری میں بڑی عقیدتمندی
اور فراخ دلی کا اظہار کرتے تھے۔" لہ

ظاہر ہے مہاراجہ کے یہی اوصاف تھے۔ جنہوں نے وجدؔ کو اس
نظم کے لکھنے پر آمادہ کیا۔

نظم "مہاتما" بھی ایک شخص کی توصیف نہیں، جس نے
اپنی فطرت عمل اور عزم ارفع سے نہ صرف انسانیت کی ہمہ
جہت خدمات انجام دیئے بلکہ یہ نظم بھی ایک علامت ہے، امن و
امان کی، سکون و اطمینان کی۔ وجدؔ چونکہ اپنی ابتدائی عمر ہی سے

لہ مغنی تبسم "فانی حیات شخصیت اور شاعری" پہلی اشاعت

گاندھی وادی رہے۔ انہیں گاندھی جی کی شخصیت گویا مہر و محبت رحم و رحمت کا ایک خوشگوار اور نکھرا ستھرا مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔ جس نے خدمت خلق کو سچی عبادت کہا تھا۔ وحید نے اس نظم کو تین حصوں میں منقسم کیا۔ پہلے حصّے کو مہاتما کی شخصیت کا آئینہ دار بنایا تو دوسرے حصّے کو گاندھی جی کے پیام سے لبریز کیا۔

زندگی بھر کسی آنکھ میں بھی غم کا آنسو چھلکنے نہ پائے
مفلسی نے اجاڑے ہیں جو گھر ان میں آسودگی مسکرائے
شمع صدق و صفا ظالموں کو مہر و الفت کا رستہ دکھائے
دین و ایمان کی روشنی میں ہر مصیبت کدہ جگمگائے
آدمی جان لینا بھلا کر جان دینے کے گر سیکھ جائے

تیسرے حصّے میں وحید نے گاندھی جی کے اصول اہنسا کو پیش کیا ہے

نرم رفتار موج اہنسا اس میں شامل ہے خون مسیحا

'جواہر لال نہرو' وحید کی ایک نظم ہے۔ جس میں انہوں نے سابق وزیر اعظم مجاہد جد و جہد آزادی آنجہانی جواہر لال نہرو کی

شخصیت کے ہر پہلو کو نکھار کر پیش کیا ہے۔ بد نظمی کے
سیاہ دور میں سچی رہنمائی اور اعلیٰ درجہ کے نظم و نسق کی
وجہ سے انھیں شب سیاہ میں تنہا مینار نور سے تعبیر کیا
ہے۔ وحید کا مصرعہ ؏

نئی حیات ملی [illegible] سعی پیہم سے

بڑا ہی بلیغ ہے۔ آزادی کے بعد بد نظمی اور فرقہ وارانہ
فسادات کی وجہ سے عوام پر جو افسردگی اور پژمردگی
چھائی تھی۔ جواہر لال کی دور اندیشی اور مدبرانہ تنظیمی صلاحیتوں
کے باعث اس کا ازالہ ہوا اور سکون و اطمینان کی فضا پیدا
ہوئی جس کو شاعر نئی حیات سے تعبیر کرتا ہے ؎

ثمر فشاں ہے مسلسل فروتنی تیری
مسافروں کیلئے چھاؤں ہے گھنی تیری
(جواہر لال نہرو)

وحید کی نظر جواہر لال کے بعد ان کی قائم مقام اندرا پریہ درشنی پر بھی
اندرا گاندھی جنھوں نے اپنی صلاحیتوں اور استطاعت سے جلد ہی
ہندوستان جیسی عظیم سلطنت کی باگ ڈور ہاتھ میں سنبھالی۔

ان کی اس جرات رندانہ پر سب رشک کرنے لگے۔ شاعر نے انھیں ع

عزیز راہ نما، شیر دل، عقاب نظر

جیسے القاب سے مخاطب کیا ہے۔ اور ساتھ ہی ضمیر قوم کا پاسباں کہا ہے۔ وحید کو اندرا گاندھی سے جو عقیدت ہے اس کا اظہار نظم کے ہر مصرعے سے ہوتا ہے جہد مسلسل پر کاربند رہنے والی اس شخصیت کیلئے یہ نظم بجا طور پر ایک نذرانۂ عقیدت ہے۔ ؎

؎ سرور عزم و عمل، امتیاز ہے تیرا
شکست و فتح سے دل بے نیاز ہے تیرا

وحید کو اندرا گاندھی کی شخصیت میں بیک وقت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی کی خصوصیات نمایاں دکھائی دیتی ہیں

؎ ستم کشوں کیلئے لطف کا پیام ہے تو
ستم گروں کیلئے تیغ بے نیام ہے تو

جلال و جمال گویا پہلو بہ پہلو ان کی شخصیت میں پائے جاتے ہیں۔ ایک قابل مدبر سلطنت کی تعریف جن الفاظ میں ممکن ہے

انھیں وجد نے بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔ مندرجہ

بالا منظومات میں کانگریس سے ان کی دلچسپی بھی مترشح

ہوتی ہے۔ اور کانگریس سے ان کی وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔

ان منظومات کے علاوہ والد مرحوم 'اشتعاق کے

نام' اور 'شیخ چاند جیلیبی' منظومات بھی لکھی ہیں۔ جو کہ اپنا کوئی

سیاسی یا تاریخی پس منظر نہیں رکھتیں۔ یہ تینوں منظومات وجد

کی ابتدائی کاوشیں ہیں۔ اور اتفاق سے تینوں مسدس کے

فارم میں لکھی گئی ہیں۔ جب کوئی فنکار منظر عام پر آتا ہے

تو پہلے اس کی نظر اپنے نواں پر پڑتی ہے۔ اور وہیں سے

اپنے لئے مواد حاصل کرتا ہے۔ انھیں شخصیتوں سے متاثر

ہوتا ہے جو بالکل قریب ہوں۔ ایک طالب علم کی حیثیت

سے وجد نے شاعرانہ زندگی میں قدم رکھا تو والد کی مفارقت

کا زخم انھیں کروٹ لینے نہ دیا۔ حساس دل شاعر کو اس کا

بڑا افسوس تھا لہذا انہوں نے مرحوم پر ایک مرثیہ لکھا

جو بڑی عفر جانبداری کا مظہر ہے۔ چار بند پر مشتمل اس مرثیہ

میں مرحوم کی ہر خوبی کو سمو دیا گیا ہے۔۔۔

تھا راہ مستقیم کا جانباز شہ سوار
مقبول خلق عاشق آقائے نامدار
مظلوم کا رفیق غریبوں کا غمگسار
غیروں کا درد مند عزیزوں کا جاں نثار

اہل وطن کو تحفۂ اخلاق دے گیا
گنج متاعِ حسن عمل ساتھ لے گیا

اس طرح وحید کے عزیز دوست شیخ چاند کی جوانی کی موت نے بھی ان کے تار احساس کو مضطرب کیا۔ کہتے ہیں مرنا تو خیر ہر کس کو ہے ہی ؎

لیکن شباب میں یہ مناسب نہ تھا سفر
دل خون ہو گیا تری بے وقت موت پر

وحید نے شیخ چاند کو نہ صرف بحیثیت ایک دوست بلکہ ایک محقق ادب کے ناطے سے بھی یاد کیا۔ اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ؎

ماتم کریں گے قدر شناسِ ادب ترا
تحقیق پہ مدار رہا روز و شب ترا

نقادِ تام دل سے بھلائینگے کب ترا
رو دینگے ذکر آئے گا محفل میں جب ترا

بے مثل و بے غرض تھیں وہ آکوشیاں تری
ہاں مقبرے کو یاد ہیں خاموشیاں تری

اس نظم کو ہم مرثیہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ نظم نیچ چاند و بندوں پہ مشتمل ہے۔ جہاں تک نظم "اشفاق کے نام" کا تعلق ہے مذکورہ بالا دونوں منظومات سے الگ اپنی نوعیت کی منفرد نظم ہے۔ اس میں وحید نے اپنے عزیز ترین دوست اشفاق حسین کو ایچ، سی، ایس کے مسابقتی امتحان میں ناکامی پر رنجیدہ دیکھ کر لکھا تھا۔ اشفاق حسین وحید کے اورنگ آباد کے تعلیمی دور سے ساتھی رہے۔ یہ نظم چھ بندوں پر مشتمل ہے۔ ناکامی کے بعد اشفاق حسین نے جب بزم ادب سے دور رہنا چاہا اور مسلسل بے روزگاری کی وجہ سے ان میں ایک بیزاری سی پیدا ہوئی، تو وحید سے دیکھا نہ گیا اور انھوں نے اپنے تاثرات کو نظم کی صورت میں ڈھالا۔ اس نظم سے متعلق مرزا ظفر الحسن رقم طراز ہیں:

پیرانِ جامعہ اور یارانِ جامعہ کے بہت
بڑے اجتماع میں سکندر علی وجد نے جبکہ
وہ بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ ایک نظم سنا کر
ہمیشہ کی طرح بے پناہ داد حاصل کی تھی
اس نظم کا ایک شعر جو بعد میں سکندر نے
منسوخ کر دیا اور اب اس کے کسی مجموعہ
میں نہیں . . . . .

نا قدری ہنر کی شکایت فضول ہے
یاں ہر گدھے کی پیٹھ پہ اطلس کی جھول ہے [۱]

وجد کے مجموعہ "لہو ترنگ" میں پورا قطعہ یوں درج ہے۔
انھوں نے مصرعہ "یاں ہر ..." کو مجموعہ میں محذوف کر دیا
ہے ؎ نا قدری ہنر کی شکایت فضول ہے
آئین نیا نہیں یہ پرانا اصول ہے
اصلاح اشتمام جہاں تیری بھول ہے

---

[۱] ... مظفر الحسن "ذکر یار چلے" حسامی بک ڈپو پتلی کمان حیدر آباد ۱۹۸۹ء

یہ ننگ ہے حیات گرامی کے واسطے

کیا رو رہا ہے جنس غلامی کے واسطے

سکندر علی وجد کو ابتدا ہی سے فنون لطیفہ سے دلچسپی رہی اورنگ آباد کے قرب وجوار کا ماحول اس ذوق کو ہوا دینے میں بڑا کارگر ثابت ہوا۔ فنونِ لطیفہ سے دلچسپی رکھنا اور بات ہے اور اس کا ماہر ہونا الگ ہے۔ وجد کی فنون سے دلچسپی نے پہلے تو ان کو ایک شاعر بنا دیا۔ اور بعد میں اجنتا، ایلورا جیسی منظومات کا تعلق۔ ان کے علاوہ وجد کی فنونِ لطیفہ سے دلچسپی نے انھیں ایسی شخصیات پر کچھ توجہ کو مرکوز کرنے پر مائل کیا جو فنونِ لطیفہ کے ماہر اور باکمال رہے ہیے طیبہ، رقاصہ پروین سلطانہ نغمے کا موت بطور خاص پیش کیے جا سکتے ہیں۔

طیبہ کوئی پیشہ ور گلوکارہ نہیں بلکہ حیدرآباد کے ایک معزز خاندان کی چشم وچراغ ہیں۔ عطیہ شیریں گفتاری و لحن داؤدی انھیں قدرت نے بچپن ہی سے ودیعت کر رکھا تھا۔ ان کی آواز کا جو مدھر لپے ہے وہ سمندر کے سمندر میں کردیتا

لیکن شام کا سماں پیدا کرنے والے انداز سے ملتا جلتا ہے
جس کا احساس ہمیں نظم کی ہیئت میں بھی ملتا ہے۔ جہاں شاعر
کو کی ہیئت کی رنگینی ۔ مدھ بھرتا ہے طیبہ کی گلیوں میں آواز کا تصور آتا ہے
وجد اپنے ممدوح کیلئے ایسے مصرعے باندھتے ہیں کہ جی
عش عش کرتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس سے بہتر انداز
میں کوئی دوسرا مصرعہ موزوں ہی نہیں۔ یہی رکھ رکھاؤ
وجد کی منفرد خصوصیت ہے۔ اس نظم میں بھی ملتا ہے۔ ایک
شعر ہے ؎

ماہ و انجم سے ہم کلام ہے تو!
بربطِ روحِ صبح و شام ہے تو

فکر و فن جب دونوں ہم آہنگ ہوتے ہیں تو فنکار کی عظمت
اور بڑھ جاتی ہے۔ یہی حال اس نظم کا ہے کہ طیبہ کی تان میں
نہ صرف فکر کی بلندی ہے بلکہ نرم آنچ کا سوز بھرا ہے
جو دلنشیں، دلنواز اور دل افروز ہے۔ ان کی دلنوائی دراصل
ساحری کا ہے جس کی وجہ سے بیخودی کا سا سماں پیدا ہو جاتا
ہے۔

ساحری ہے کہ خوش نوائی ہے

بزم پر مست بے خودی سی چھائی ہے

وحید کی نظم "رقاصہ" بھی تارا چند بھٹری سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ "رقاصہ" ایک نظم ہوتے ہوئے ساوری کی مرقع بھی ہے۔ جس میں ایک رقاصہ کے سراپا کے ساتھ ساتھ رقص کے ماحول اور اس کے اثر و کیفیت کو دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ تصورات میں رقاصہ کا رقص اور اس کے کرشمے سب کچھ سما جاتے ہیں۔ یوسف ناظم نے بجا طور پر رقم کیا ہے۔ " رقاصہ کو بھی انہوں نے (کسی مصلحت کی بنا پر) سننے کی چیز بنا دیا تھا"۔ ؎۱

'رقاصہ' میں رقص کے پیچ و خم، جلال و جمال اور کمال فن کو یکجا کر کے وحید نے اس کی عظمت کو اور بھی دوبالا کر دیا ہے

بدن زندگی کا چھلکتا پیالہ

چمن کی بہاروں نے پھولوں میں پالا

؎۱ یوسف ناظم " کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں" کتاب نما ماہنامہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ مارچ ۱۹۸۲ء

جنوں کو نزاکت کے قالب میں ڈھالا
امنگوں کی لہروں پہ باہر نکالا
نگاہوں کی جنت دلوں کا اجالا
جمال اجنتا جلال ہمالا
اٹھی موج مے کی طرح انجمن میں
تڑپنے لگیں بجلیاں جان و تن میں
قد دلربا حسن بے باک چنچل
ہلالی بھویں روئے روشن پہ بے کل
مدیرا بھرے نین مستی سے بوجھل
لطافت مجسم جوانی مکمل!
نظر شعر رفتار نغمہ مسلسل
چھنکتے ہیں گھنگرو چھنکتی ہے پائل
عجیب رنگ سے روشنی کر رہی ہے
سر بزم قوس قزح بن رہی ہے

رقص کی ابتدا کچھ ایسے ہوتی ہے جیسے اندھیرے میں شتاب شعلہ جلتی ہے اور کبھی ایسا لگتا ہے جیسے جوشش مستی میں

طاؤس رقصاں ہے۔ ہر ادا سے جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے۔
رقص و راگ سر و تال کے تاملیں سے حسن فن کی ابتدا ہوتی
ہے۔ وحید کی فنونِ لطیفہ سے دلچسپی اس نظم کی معراج ہے
ورنہ رقاصہ کے سراپا پر کتنے ہی شعراء نے قلم اٹھایا۔
لیکن اس انداز سے اسکو پیش کرنے سے قاصر رہے
'نغمے کی موت' اور 'پروین سلطانہ' میں بھی انہوں نے ان
کے فن کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ کلاسیکل موسیقی
کے ماہر فنکار و گلوکار استاد امیر خاں ساٹھ سال کی
عمر میں جب کار کی زد میں آگئے اور بیحان بحق ہو گئے تو
موسیقی کے دلدادہ و شیدا وحید بے حد متاثر ہوئے اور
نظم "نغمے کی موت" کو تلمبند کیا۔ عنوان نغمے کی موت
ہی سے یہ واضح ہے کہ وہ استاد امیر خاں کو منفرد
گلوکار سمجھتے تھے۔ جن کی آواز میں دریا کا مد و جزر اور
چاندنی کا سا سکوں ہے تو ہر تان گویا شاہکار نغمہ
نغمہ سرائی کے گر سے واقف، فکر و فن سے بخوبی آگاہ
جب ان کا ارتحال ہوا تو وحید نے کہا تھا۔ ؎

سانس کے نفس کا راز داں تھا

راگوں کا امین پاسباں تھا

نغمے کا نظام جانتا تھا

ایک ایک مقام جانتا تھا!

مہلت نہ ملی مگر بیان کی

اک آہ میں ختم داستاں کی

اسی طرح سرزمین آسام کا تارہ جب سپہر موسیقی پر چمکا تو ہندوستان بھر میں اس کا بول بالا رہا۔ پروین سلطانہ کو یہ دولت کچھ ورثے میں اور کچھ اپنے استاد بڑے غلام علی خاں کی تربیت سے ہاتھ آئی۔ لیکن انہوں نے فن کو اسقدر اپنایا کہ خود ان کے استاد ان سے بہت پیچھے دکھائی دیتے ہیں گانے کے دوران کبھی کبھی استاد امیر خاں اور بڑے غلام علی خاں جیسے باکمالوں کے ہاں بھی سر ٹوٹنے کا اندیشہ رہتا اور کبھی کبھار ٹوٹ بھی جاتا تھا۔ لیکن پروین سلطانہ کو فن اور خود اپنے سر پر اتنی گرفت ہے کہ انہوں نے ایسا موقع آنے ہی نہیں دیا۔ پروین سلطانہ نہ

ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کی بانی ہوئی گلوکارہ ہیں۔ انہیں
۱۹۸۷ء میں بہترین گلوکارہ کا ایوارڈ بھی ملا ہے۔ وحید نے
ان پر ایک مختصر مگر جامع نظم لکھی ہے ؎

ہر تان کی پرواز کا اعجاز تو دیکھو

خود ساز ہے بے حال یہ انداز تو دیکھو

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک

شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

یہاں وحید نے تضمین کے سہارے غالب کے اس مصرعہ
شعلہ سا چمک ...... آواز تو دیکھو
استعمال کر کے اس نظم کو پیرٹ کو وہ بنا دیا ہے "نیلی ناگن"
بھی ایک یوروپین وائلن نواز یوحینا دوشانسیکا سے
متاثر ہو کر لکھی ہے لیکن یہاں وحید فن کی بجائے
فن کار کو پیش کیا۔ اس نظم میں جذبات کا بہاؤ صاف اور
تیز دکھائی دیتا ہے ؎

یہ چہرۂ گلرنگ یہ مہکتے ہوئے گیسو

یہ رنگِ شفق میں ہے نہ پھولوں میں یہ خوشبو

اب دیکھئے ؎

دھلکے ہوئے سونے کی طرح زلف کی رنگت ؎

آنکھوں میں نظر بند ہیں شبنم کے شرارے

وحید نے اس طرح اپنی منظومات میں ہر شعبے کے اور ہر زمانے کے ماہر فن و تاریخی شخصیات کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کے علاوہ اس زمرے میں ہم منظومات "نکتہ چیں" اور "تحسین ناشناس" کو بھی شامل کر سکتے ہیں جو بعد میں بعنوان "تبصرہ نگار کے نام" شائع ہوئی تھی ان دونوں منظومات میں غزل کا سا رنگ پایا جاتا ہے۔ لیکن انداز بیانیہ ہے وحید حسن پرست تھے۔ اور ہر چیز کے محاسن سے بہت جلد متاثر ہوتے تھے تنقید یا نکتہ چینی تو دور کی بات ہے۔ کسی چیز کے قبیح پہلو پر بھی ان کی نظر نہیں رکتی تھی۔ پھر بھلا اس پر اعتراض کیوں نہ ہوتا جو اچھی بھلی چیزوں میں کیڑے نکالتے ہیں۔ نکتہ چیں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

؎ فردوس نظارہ ہے مرا حسن نظر دیکھ
بکھرے ہیں ترے سامنے کیا لعل و گہر دیکھ

اور ناصحیں کہا ہے ؎

گلزار ہو یہ خار یہ ممکن نہیں ناداں
کانٹوں میں الجھنا نہیں اچھا گل تر دیکھ

اس طرح متنبہ کرنے کے باوجود جب تبصرہ نگاروں کی نظر کانٹوں میں الجھ کر رہ گئی تو انہوں نے تحسین ناشناس کے زیر عنوان ایک نظم لکھی ؎

کیا تجھ کو دکھاؤں درِ شہوارِ معانی	نایاب جہاں میں ہر دیدہ وری ہے
توصیف کمالات جنوں میری عبادت	تنقیص ترا مشغلۂ نوش بسری ہے
تاریک ضمیروں پہ اثر کر نہیں سکتا	اشعار میں جو سوز دعائے سحری ہے
تحقیق ہو تنقید ہو تقریر ہو کچھ ہو	ہر حال میں مشکوک تری معتبری ہے

اس طرح تبصرہ نگار کی خبر لینے کے بعد کہتے ہیں ؎

افکار کی پر نور فضاؤں کے سفر میں	خفاش کو ناحق ہوس ہم سفری ہے
اردو کے گلستاں کا ہے یہ بھی المیہ	ہر بوم کو دعویٰ ہے کہ وہ کبک دری ہے

تاریخی شخصیات کے علاوہ وحید نے تاریخی عمارات و مقامات

سے بھی اثر قبول کیا۔ نہ صرف اورنگ آباد بلکہ سرزمین ہند
کی کئی تاریخی عمارتیں جن سے ماضی کی حسین و اَن مٹ کہانیاں
وابستہ ہیں۔ اور وہ مقامات جہاں فنکاری کے گراں بہا
خزانے مدفون ہیں۔ ان کی منظومات کے عنوان بنے۔ اس
سلسلے میں ان کی منظومات "تاج محل" اجنتا" ایلورا"
بطور خاص پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جہاں قدیم ہندوستانی
فن تعمیر، سنگ تراشی، و حجارہ گدازی (ایلورا) نقاشی
و مصوری (اجنتا) کے علاوہ ہند السانوی فن تعمیر کی کاری
کے نادر نمونوں (تاج محل) کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ وحید نے
ادبی دنیا میں انہیں پیش کر کے فن تعمیر کو ابدیت عطا کیا ہے۔
ان کے علاوہ وحید نے ان مقامات کو بھی شعری پیکر میں ڈھالا ہے
جو آج دکن کی تہذیب کے مظہر ہیں "علی ساگر" نظام آباد کے قریب
واقع ایک خوش منظر مصنوعی جھیل ہے۔ جس کو عصری ضرورتوں
کی تکمیل کیلئے نیا رنگ و روپ دیا گیا ہے۔ وحید نے نظم "علی ساگر"
میں اس جھیل کے پس منظر اور پیش منظر کی تصویر کشی کی
ہے۔ یہ مصرعہ ؎

ع علی ساگر ہیں عسرتم کامرانی موجزن دیکھا

اسی طرح ایک اور مصرعہ ع

ع صفاکشوں نے یہ رحمت کا دریا کر دیا جاری

اس جھیل سے اپنی وابستگی کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ حب الوطنی کا عنصر جھلک پڑتا ہے۔ بند ملاحظہ ہو ۔

تری خاک چمن کو میں نے پلکوں سے اٹھایا ہے
گل و ریحاں کو تیرے اپنی آنکھوں سے لگایا ہے
تری رعنائیوں میں اپنے شعروں کو بسایا ہے
تری تعریف کے نغمے تجھے پہروں سنایا ہے
مری آواز کی تجھ کو رہے گی آرزو برسوں!
مجھے بھی اے علی ساگر کرے گا یاد تو برسوں

عصر حاضر کی سائنسی، صنعتی و تہذیبی پیش رفتار کو وجد نے جن منظومات میں پیش کیا ہے، ان میں جوہر، بم، امن کا پھول اور سالار جنگ میوزیم، اہم ہیں۔ سالار جنگ میوزیم نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ کا تہذیب کردہ ہے۔ جس کو انہوں نے اپنے ذوق و شوق، ذاتی مالیت اور علمی

کوشش سے علم، تہذیب اور تمدن کا مرکز بنایا ہے۔ اس میوزیم میں فنون لطیفہ کے علاوہ دیگر نادر و نایاب اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے شاہکار دل و نظر کو دعوت فکر دیتے ہیں۔ فن پارچہ بافی، شیشہ گری، سنگ تراشی، چوب تراشی، مصوری کے نمونے اعلیٰ پیمانے پر پائے جاتے ہیں۔ جب وحید نے تہذیب رفتہ کے اس 'ایوان' سالار جنگ میوزیم کو دیکھا تو اپنے تاثرات کو یوں قلمبند کیا ؂

کیا دولت بیدار ہے ارباب ہنر کی،
قیمت ہے یہاں ہیچ زر و لعل و گہر کی،
یہ گنج گراں مایۂ تہذیب و تمدن،
معراج ہے حسن عمل و ذوق نظر کی

میوزیم میں اسی حسن عمل اور ذوق عملی کی کار فرمائی ہے اور معراج بھی۔

ہندوستان نے پر امن ایٹمی تجربے کیے تاکہ قومی ترقیات کو تیز تر کیا جائے۔ وحید نے اس کو "نیا پھول" سے تعبیر کیا۔ لیکن ان کے مجموعہ کلام بیاض مریم میں یہ نظم "امن کا پھول"

بن گئی۔ وحید نے جہاں تمدن گزشتہ کو شاعری میں سمویا
وہاں تہذیب حاضر کی بھی اپنے کلام میں آئینہ داری کی۔
وحید کے الفاظ میں یہ ایک نئے دور کا آغاز ہے ؎

امن کا پھول کھلا
دور پہنچی ہے چٹکنے کی صدا پر خوشبو
آج خوشیوں کا امیدوں کا سہانا دن ہے

اب وحید کو یاد آتی ہے ان لوگوں کی ان بہادروں اور جیالوں
کی جنھوں نے امن عظیم کامیابی کیلئے اپنا خون پسینہ ایک کیا
جواہرلال ایک ایسا بہادر اور جیالا انسان تھا اپنی نظم میں
وہ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

خوشنما خواب جواہر نے جو دیکھا تھا کبھی
اس کی تعمیر سے روشن ہے گلستان وطن
سارے ہمسایوں سے کہہ دو کہ یہاں
دوستی اور مروت کی بہار آئی ہے

شعریت کی فراوانی جیسا کہ ان کی ہر نظم میں ملتی ہے
اس نظم میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہ ایک آزاد نظم ہے

جو بندھے ٹکے قوانین اصول و ضوابط کے دالہ و شیدا وجد کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی۔ وجد نے اس نظم کو ردیف و قافیہ کے بندھن سے آزاد کرنے کی کوشش کی تاہم یہاں بہاں ان پیسروں کی کارفرمائی ضرور ملتی ہے۔

شعر 'مارلین منرو'، 'عہد آفریں دس سال' وجد کی معرا منظومات ہیں جو اسی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اول الذکر دونوں منظومات میں ان کی یہ کوشش کامیاب ہوئی لیکن موخرالذکر 'عہد آفریں دس سال' میں پھر وہی قافیہ پیمائی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مصرعہ ۱ عہ ۲ عہ ۳ اور عہ ۴ ہم قافیہ ہیں۔

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سر راہ وفا ۔ ۱
اک بےباک عمل مست دل آویز کرن ۔ ۲
آئی پیر نو سویرے کی بشارت لے کر ۔ ۳
صبح ہم سارے پا فرض کا آغاز ہوا ۔ ۴
۱۹۴۹ کا پھول کھلا سلسلم کا تارا چمکا ۔ ۱

آج پھر تازہ ہواؤں سے لہکتا ہے چمن۔ ۲

کون کہتا ہے کسی آنکھ میں آنسو نہ رہا۔ ۱

تلملاتا ہوا زخموں سے وطن گزرا ہے۔ ۴

ابھی دکھ درد کی بھیگی ہوئی پلکیں ہیں مگر۔ ۳

مسکراتے کا غریبوں کو سہارا تو ملا۔ ۱

سرد الفاظ نے صدیوں میں زبان پائی ہے۔ ۴

کس کی سمت سے یہ دلدار سحر آئی ہے۔ ۴

وجد کی نظم 'شملہ' میں حقائق زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں شملہ کے مجبور اور مفلوک الحالی انسانوں کی بے سروسامانی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ لیکن نظم 'صبح شالا مار' میں صرف فطرت کے حسین و دلنواز مناظر کی عکاسی ملتی ہے۔

نظم 'شملہ' کے اشعار ہیں ~

شہر کے ہر راستے پر ٹھیک روکا شور ہے

ان پہاڑی سیکڑوں میں میکشی کا زور ہے

برق کی رو سے دل ہر ذرہ ہے کیوں داغ داغ

کھا نہیں بے تیل ہیں مدت سے مٹی کے چراغ

وحید کی منظومات تاج محل، چراغ نشاط محل، مزار عالمگیر، ملی ساگر اورنگ آباد، حیدرآباد، تیظرو وطن، ترانہ دکن، اور کی ہم' میں تمدنی و ثقافتی عناصر کی عکاسی ملتی ہے۔ ان منظومات میں ہندوستان کے تاریخی و تفریحی مقامات اور عمارتوں کی وحید نے بڑی خوبی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے

تاج محل سے متاثر ہو کر تقریباً ہر شاعر نے اس پر قلم اٹھایا ہے۔ کسی نے اس کو محبت کی علامت بنا کر پیش کیا تو کسی نے اس کو حسن کا شاہکار کہا۔ اور کسی نے اس کے اندر مستور ان جذبات کو ملحوظ رکھا جو اس کی تعمیر کا باعث ہے۔ کسی نے اس کو مقابر شاہی کہا، کسی نے اس کے ظاہری حسن و جمال پر اظہار خیال کیا۔ جہاں تک سکندر علی وجد کا تعلق ہے انھوں نے تاج محل کی بناوٹ اور اس کی ساخت پر بڑی فنکارانہ نظر ڈالی، اور فن تعمیر کی لافانی حیثیت کو پیش کیا ہے۔ نظم کے پہلے بند کا آخری شعر ملاحظہ ہو ؎

جادو نگاہِ عشق کا پتھر پہ چل گیا
الفت کا خواب قالب مرمر میں ڈھل گیا

تو اب الفت کو مرمریں شکل دیکھ کر شاعر نے اسکو نظم کا جامہ پہنایا۔ ان کو اس عمارت کے خمیر میں ابدی محبت کارفرما نظر آئی۔ جو خود عمارت کی لافانیت کی غماز ہے۔ تاج محل کی عظمت و رفعت کے مہر و ماہ تک بھی منکر نہیں سنگِ مرمر کے حسین گنبد پر منعکس ہوتی ہوئی شعاعوں کو دیکھ کر شاعر کی عقیدت کے جذبات متحرک ہو جاتے ہیں۔

ہیبت سے تیری دلکشی بے پناہ کی
گنبد پہ کانپتی ہے کرن مہر و ماہ کی

اس کے برعکس وحید کی فنون لطیفہ سے دلچسپی انھیں عمارت کی جزئیات اور مہر و ماہ کی روشنی میں اس کی دلکشی کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ بقول رشید حسین خاں :

"حسن تعمیر کو واضح کرنے کیلئے تاج محل پر ان کی جو نظم ہے۔ اس کا صرف ایک مصرعہ کافی تھا۔ ع
چھنتی ہے جالیوں سے نزاکت خیال کی"۔ ۱؎

۱؎ رشید حسن خاں "وحید کی شاعری چند اشارے" وحید شاعر و شخص" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۸۶ء

"چراغ نشاط محل" بھی وحید کی ایک بہاریہ نظم ہے جسمیں ماضی کی تابندہ یادوں کی جھلک ملتی ہے۔ یہ نظم شاعر کے رجائیہ و طربیہ رجحان کی غماز ہے ؎

دل و نگاہ پہ مثل خمار چھائی ہے
ہنوز کیفیت عشرت زمانۂ دوست

نظم "مزار عالمگیر" میں شاعر نے اورنگزیب عالمگیر کے دورِ حکومت، اس کی عظمت و شکوہ اور اسکے جاہ و جلال کی تصویر کھینچنے کے بعد اسکی موجودہ حالت کی بھی عکاسی کی ہے ؎

ایک ہی انجام ہے کمزور اور شہ زور کا
پیس کر دونوں کو رکھ دیتا ہے کونا گور کا

مزار عالمگیر خاک کا ایک تودہ نہیں بلکہ دنیا والوں کیلئے ایک عبرت کدہ بھی ہے کہ سطوت شاہی بھی منزل ممات سے ضرور گزرے گی۔ موت کی منزل سے ہر شاہ و گدا کو گزرنا ہے اس سے کسی کو مفر نہیں ؎

موت نے جوہر مٹا ڈالا دم شمشیر کا
ایک ہی سانچے میں ڈھل گیا تدبیر کا

آخری بند میں شاعر نے زندگی کی بے ثباتی کے فلسفے کو بڑے ہی آسان اور موثر طرز انداز میں نظم کیا ہے اور "اللہ باقی" کا ایک خوبصورت نمونہ پیش کیا ہے ؎

عمر ڈھلتی دھوپ ہے اس کی حقیقت کچھ نہیں
دولت دنیا ہے دھوکہ شان و شوکت کچھ نہیں
شادی و غم دو گھڑی کے عیش و راحت کچھ نہیں
سارے خالی ڈھول ہیں اقبال و عظمت کچھ نہیں
صاف و روشن فیصلہ ہے یہ دلِ آگاہ کا!
نقش مٹ جاتے ہیں سب رہتا ہے نام اللہ کا

یہ نظم نہ صرف تاریخی حیثیت سے ممتاز ہے بلکہ یہ وحید کی فلسفیانہ ذہنیت کا آئینہ دار بھی ہے۔

حیدرآباد، اورنگ آباد، اور ترانۂ دکن جیسی منظومات دکن سے وحید کے والہانہ وابستگی کی غماز ہیں۔ ان میں انھوں نے اپنے تربیت کدوں کی شان کو بڑے ہی پر شکوہ انداز میں بیان کیا ہے۔ یوں تو وحید بیجاپور میں پیدا ہوئے لیکن ان کی تعلیم و تربیت کا آغاز اورنگ آباد میں ہوا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ان کا

پیمانۂ فکر لبریز ہوا۔ لہٰذا اورنگ آباد سے ان کی یہ وابستگی انہیں نظم "اورنگ آباد" لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس نظم میں وجد کا لہجہ مثنوی کا سے میلان کھاتا ہے۔ وہی فارم، وہی روایتی انداز بہاریہ و بیانیہ اندازہ میں اورنگ آباد کی آب و ہوا، مناظر قدرت مظاہر فطرت وہاں کے محل وقوع اور اسکی تاریخی تہذیبی و ادبی حیثیت کو بڑی ہی خوبصورتی سے نظم کیا ہے ؎

لٹاتے ہیں ترے آثار کی توقیر ہوتی ہے
تری آغوش میں تہذیب اہل ہند سوتی ہے،

ترے کہسار میں ہے عزم خلجی بے قرار اب تک
فضا میں ہمت تغلق کا اڑتا ہے غبار اب تک

ترے دامن میں عالمگیر میٹھی نیند سوتا ہے
جلال قطب شاہی اپنی بربادی پہ روتا ہے

حصاروں میں تری نکلا نتیجہ سعی پیہم کا
ترے مشرق سے پہلا آفتاب صفی چمکا

دلی کے نغمۂ جاں سوز گونجے تیری محفل میں
سراج بزم عرفاں سے اجالا ہے ترے دل میں

اس تاریخی و تمدنی تمہید کے بعد شاعر اس مقام سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتا ہے ؎

ترے ہی سحاز پر میں نے سنے نغمے جوانی کے
ترے ماحول میں سیکھے ہیں گر سبا دو بیانی کے

شہر حیدرآباد وجد کا پسندیدہ و محبوب شہر ہے۔ ان کی تربیت کدروں میں اس شہر کو دوسرا مقام حاصل ہے لیکن یہ نظم "اورنگ آباد" سے اپنے مواد و ہیئت دونوں زاویوں سے مختلف ہے۔ اس کی ابتدا وہاں کی فضا کے جاں فزا کی دلکشی سے ہوتی ہے۔ حیدرآباد کے ماحول کی معتبریات اور وہاں کی تہذیبی اقدار کو نظم کرنے کے بعد شاعر اپنی عقیدت کو یوں الفاظ کا روپ دیتا ہے ؎

اگر مہر و الفت کی جنت کہیں ہے
تو بے شک یہیں ہے یہیں ہے یہیں ہے

اورنگ آباد سے شاعر کی وابستگی نے ان کو وہاں کے ماحول کو نظم کرنے پر آمادہ کیا لیکن نظم حیدرآباد وہاں سے دور ہونے کے بعد لکھی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں ہمیں

وہ تاثر جھلکتا ہے جو ایک قریب ترین دوست کے فراق سے
حاصل ہوتا ہے اسکو اس حسین و خوشگوار یاد سے تعبیر
کر سکتے ہیں۔ اسلئے کہ ؎

تری یاد، یاد وطن سے ہے خوش تر
ترا ذکر تسکین قلب حزیں ہے

۱۹۵۶ء میں جب اورنگ آباد اور حیدرآباد دو مختلف
صوبوں میں شامل کر دیئے گئے تو وحید کے دل پر گویا بجلی سی
گری انہوں نے لکھا ہے۔ ؎

زمانہ دل آزار ہے بھی تو کیا غم
مجھے تری دلداریوں کا یقین ہے

ترانۂ دکن اور نذر وطن بھی وحید کی شاعرانہ
زندگی کے دو مختلف ادوار کی پیداوار ہیں۔ نظم "ترانۂ دکن"
وحید نے آزادئ ہند سے پہلے رقم کی تھی۔ جبکہ "نذر وطن"
بالکل بعد کی تخلیق ہے۔ "ترانۂ دکن" میں شاعر دکن کو ہندوستان
سے الگ تھلگ دیکھتا ہے۔ اس کی انفرادی خصوصیات
سے اس کو یاد کرتا ہے۔ شاید یہ اس وقت کی ایک عام بات

تھی۔ کیونکہ بقول فانی بدایونی یہاں کے لوگ ع

ہندوستان میں رہتے ہیں ہندوستان سے دور

کے مصداق دکن اور صرف دکن کے والہ وشیدا تھے۔ لیکن جب شاعر اپنے شعور کی رفعت کو پہنچا تو اس کو حقیقت کا پتہ چلا۔ وحید نے نظم " نذر وطن " میں دکن اور شمالی ہند کی رنگینیوں کو ہم آہنگ کیا اور مختلف مقامات کی دلکشی کو ایک ساتھ بیان کر کے اس کی بوقلمونی کو نکھارا اور اس میں ایک نیا عنصر شامل کیا۔ جسکو تمدن سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ؎

کہیں جواب نہیں ترے کہساروں کا
سماں عجیب ہے گنگ وجمن کے دھاروں کا
مثال قوس قزح رنگ کشت زاروں کا
فضا میں عطر ہے تہذیب کی بہاروں کا
زمانہ تیرے فسانے بھلا نہیں سکتا
نقوش تاج واجنتا مٹا نہیں سکتا

شاعر نے تاج و اجنتا کے تاثر سے جو نکھرا ستھرا

تصور ابھارلے ہے وہ فنکاری کا نادر نمونہ ہے جو (INDO)
(SARACENIC) ہند اسلامی تہذیبی و تعمیری نمائندگی
کرتا ہے۔ جو اجنتا خالص ہندوستانی اور تاج خالص
اسلامی فن تعمیر کے نمائندے ہیں۔ وجد نے اس قسم کی
تاریخی منظومات میں تمدنی اثاثے کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو اس
دور کی یادگار ہونے کے ساتھ ساتھ اس قوم کی ثقافت
تہذیب اور فکری بلندی سے متعلق اشارے کنایوں
ہی میں سہی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ فن کو جب تک فنکار کے
خونِ دل و جگر سے سینچا نہ جائے اس میں شادابی نہیں آسکتی
اور فنکار جب تک اپنا رشتہ سماج سے استوار نہیں کرتا خون دل
و جگر بہم نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا ہر فن سے اپنے دور کے سیاسی
و ثقافتی عناصر ضرور منعکس ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر مجید بیدار
کے بموجب:

ایسا ادب جو تمدنیات کی عکاسی کرتا ہو۔ اس پر
لازم ہے کہ وہ ان ضرورتوں کی نمائندگی کرے
تاریخی یادگاریں، تمدنی اشارے ثقافتی جھلکیاں

فکری ادراک:[1]

وحید کے کلام میں پہلی بار ان چاروں عناصر کا سنگم نظر آتا ہے۔ ایک نرالا اور انوکھا سنگم جو خوبصورت بھی ہے اور کارآمد بھی ؎

کمند گردش ایام کے اسیر نہیں
نقوش دست عقیدت فنا پذیر نہیں

اجنتا میں کل ۲۹ غار پہاڑوں میں تراش کر بنائے گئے ہیں۔ جن میں بدھ مت کے ۲۴ وہار اور ۵ دیول ہیں۔ اجنتا کے غاروں میں جو دیواری تصاویر بنائی گئی ہیں۔ ان میں قدیم ہندوستانی فن جھلک پڑتا ہے۔ رنگ آمیزی کے دوران قد و قامت کے تناسب کو باقاعدہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ وہار اچانک رونما ہوئے ہیں حالانکہ اس میں صدیوں کی سعیٔ انسانی مستور ہے ؎

جہاں خون جگر پیتے رہے اہل ہنر برسوں
جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں

---

[1] ڈاکٹر مجید بیدار "وحید کی شاعری میں تہذیبی تمدنیات" ماہنامہ سب رس حیدرآباد جون ۱۹۷۶ء

اس تہذیبی وادی کو شاعر نے اپنی چھٹی حس سے محسوس کیا اور الفاظ کے پیرائے میں بڑی خوبی سے ڈھالا ہے۔ نظم اجنتا کو وجد نے مسدس کے فارم میں لکھا۔ جس میں کل گیارہ بند ہیں اور ہر بند اپنی جگہ بھرپور اور معنی خیز ہے۔

مہذب وادی میں خوشنما نمونوں کی وجہ سے جو دلکشی آئی ہے۔ وہ وہاں کے ماحول کو خوش منظر بنا دیا ہے ؎

شراب و شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں
بہار زندگی غلطاں ہے سبزے کی اداؤں میں

اور پھر کہتے ہیں ؎

یہاں صدیوں سے رقصِ پر سکون شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

اس وادی کو پائے تکمیل تک پہنچانے کیلئے جس عزم و ارادے کی ضرورت تھی وہ عزم عزمِ گوتم سے کچھ کم نہیں تھا۔

ان غاروں کو شاعر نے جامِ جمشید سے تشبیہ دی ہے جس میں اس دور کے تمدن کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ع

تمدن منعکس ہو جس میں ایسا ساغرِ جم ہے

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تہذیب کا قافلہ امن کی تلاش میں شہر سے باہر ان پہاڑوں میں ہو آیا لیکن فسوں کاروں نے اس کو اپنے جادو کے بل پر ساکت کر دیا انہیں جاودانی بخش دی۔ مختلف غاروں میں مختلف واقعات کی تصاویر موجود ہیں۔ ان تصویروں میں سدھارتھ کی تخت نشینی بدھ مت کی ابتدا عروج و زوال تک کے پورے پورے واقعات کی مرقع کاری کی گئی ہے گویا ان غاروں میں پوری ایک دنیا بسی ہے ۔؎

کہیں پیدا ہے ساری کیفیت صحنِ گلستاں کی
کہیں رونق نظر آتی ہے بازار و شبستاں کی
کہیں حیرت زبانِ حال ہے حالِ پریشاں کی
لکیریں ہیں کہ شریانیں دلِ انساں و حیواں کی
کہیں ظلمت کے پیچھے روشنی محسوس ہوتی ہے
کہیں تو موت میں بھی زندگی محسوس ہوتی ہے

اس بند کا آخری مصرعہ بلیغ معنی لئے ہوئے ہے ۔ یہ اس تصویر کی طرف اشارہ ہے جس میں بدھا کے ارتحال کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں سدھارتھ کی موت پر ان کے پیروؤں کے جذبات

غم و اندوہ، حیرت و افسوس کی ملی جلی کیفیت کچھ اس طرح جھلکتی ہے کہ ہمیں اس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ لہٰذا شاعر نے اس منظر ممات میں زندگی کا جوہر پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بودھی ستو پدما پانی کی تصویر بھی منفرد خصوصیات کی حامل ہے وجہ جزئیات نگاری میں بڑا کمال حاصل ہے۔

ارباب فن کی سعی پیہم کا نتیجہ ہے کہ ان چٹانوں میں شباب و حسن کا دریا رواں ہے ؎

ملا ہے زندگی کو بانکپن ان کج کلاہوں سے
نظر والوں پہ شمشیریں برستی ہیں نگاہوں سے

ان نقوش کو جو ثبات حاصل ہے وہ بھی ان ارباب ہمم کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ جنہوں نے اپنے خون دل و جگر سے ان نقوش میں لالی بھر دی ہے۔

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لافانی
تصدق جن کے ہر خط پر تخیل خامۂ مانی
مشکل ہے شباب و حسن میں تحلیل انضمانی
تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوق عریانی

حسینان اجنتا کا جنوں سرتاج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بقول ڈاکٹر وحید اختر :-

" وحید کی اکثر ابتدائی نظمیں جن میں ان کے شاہکار بھی شامل ہیں مسدس کے فارم میں ہیں اور انیس کے فنی کمال کی بازگشت ان میں ملتی ہے مگر جو شاعر یہ کہہ سکے کہ
' تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوق عریانی '
اپنے رویئے میں قدامت پرست اور روایت گزیدہ ہرگز نہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ جدید ذہن کی نمائندگی کرتا ہے۔" ؎۱

۱۹۷۳ء میں جب انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی سالانہ تقریب اورنگ آباد میں منعقد ہوئی تو مندوبین کی یہی خواہش تھی کہ اجنتا اور ایلورا جائے اور اس کو دیکھنے سے

؎۱ ڈاکٹر وحید اختر "بیاض مریم کا شاعر" سہ ماہی رسالہ "ہماری زبان" انجمن ترقی اردو نئی دہلی یکم نومبر ۱۹۷۷ء

پہلے اس نظم کو وجد کی غزیانی سن لیں۔ کیونکہ بقول یوسف ناظم
وجد نے اجنتا ایلورا اور تاج محل کو سننے کی چیزیں بنا دیا
ہے۔ جب حسب خواہش اجنتا سنائی گئی تو اس مصرعہ پر
تقریباً ہر مندوب عش عش کرنے لگا۔ ع

'تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوق عریانی'

تقدس اور عریانیت کو ایک ساتھ اور اس لحاظ سے کہ دونوں
میں توازن بھی برقرار رہے۔ کسی اور شاعر نے شاید ہی پیش
کیا ہو۔

اسی طرح ایلورا بھی ان کی شاہکار ہے۔ یہ بھی اجنتا
کی طرح مسدس کے فارم میں لکھی گئی ہے۔ ان غاروں میں سنگ
تراشی و مجسمہ سازی کے فن کی معراج دکھائی دیتی ہے ؎

مئے خیال ہے سنگین آبگینوں میں
دلوں کا سوز نہاں پتھروں کے سینوں میں

فنکاروں نے جب اپنے ذوق و شوق سے فن کو فکر و تخیل کے
پر لگائے۔ اور چٹانوں جیسے مضبوط و مستحکم عزائم سے اپنے
تصورات کو پتھروں پر تراش کر دیا ؎

تصورات کے پیکر تراش ڈالے ہیں
دیئے وہ دل جو ہمیشہ دھڑکتے والے ہیں

خارہ گدازوں نے مصمم ارادوں سے فن کو معراج (مقام) پر پہنچایا یا ان
کی نظر عقابی تھی تو ان کے تیشے برق پاروں کے تھے مصائب
کا انھیں مطلق غم نہیں تھا۔ اپنے تخیل کے زور پر ایسے
مجسمے بنائے کہ وہ اپنی الگ دنیا رکھتے ہیں۔ ان کے چہروں
پر جمال و جلال کا ایک حسین امتزاج نمایاں ہے۔ بدھ، جین
اور برہمن مذاہب کے بیشمار اصنام پتھروں ستونوں
اور غار کی اندرونی دیواروں پر کچھ اس طرح تراشے گئے ہیں
کہ زائرین وہاں خود کو ان کی دنیا میں پاتے ہیں۔ کیلاش کا مندر
جو آفاقی شہرت کا حامل ہے انہی غاروں میں سے ایک ہے
اسکی اہمیت اسطرح بھی ہے کہ یہ مندر زیر زمین صرف ایک
ہی پتھر میں تراشا گیا ہے۔ یہاں ہندوستانی سنگ تراشی
کے ایک سے ایک اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ رقص کرتی ہوئی مورتیں
ہیں جو لہردار حرکت دکھائی گئی ہے۔ وہ ان فنکاروں کا اپنا
حصہ ہے ۔

نگار خانۂ عالم کا عکس یہ وادی ۱۶۳

ہزار حشر بداماں خموش آبادی

جہاں مرد و زن کو تھی عرض ہنر کی آزادی

یہاں نہیں ہے کوئی نقش فریادی

تلاطم عرضِ حالات حسن کار نہیں

کمال فکر کے شہکار اشتہار نہیں

اکرم محمد حسن اپنی تصنیف شعر لو میں رقم طراز ہیں :-

"سکندر علی وجد کی نظموں میں بیانیہ عنصر کا غلبہ ہے۔ اور اس بیانیہ عنصر سے وجد نے بڑے بڑے کام لیے ہیں۔ ان کی نظم اجنتا نہ صرف موضوعات کے اعتبار سے اس دور کی کامیاب نظموں میں ہے بلکہ اس میں خیال اور احساس کے عنصر کو جس چابکدستی سے یکجا کیا گیا ہے۔ وہ اپنی آپ نظیر ہے۔"

بیانیہ انداز وجد کے ہاں ہر طرح کی منظومات میں ملتا ہے

چاہے وہ قومی ہو یا کوئی اور وحید کی منظومات میں قومی شاعری کے عناصر کی بھی فراوانی ہے۔ وحید کی اٹھان کا زمانہ وہی تھا جس میں آزادی کی جدوجہد کو فروغ حاصل ہوا۔ برطانوی سامراج کے ظلم و ستم تحدیدات و موانعات کے باوجود نازک ترین حالات میں بھی آزادی کی خواہش کم نہیں ہوئی بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی کے مصداق اور بھی بڑھتی چلی گئی اور ہر زبان میں قومی شاعری عروج پانے لگی۔ اس ضمن میں اردو کے شعراء چکبست جوش اور حسرت کے نام بطور خاص لئے جاتے ہیں۔ سکندر علی وجد چونکہ ابتدا ہی سے ملک و قوم کے ہر ذرہ کی خوبی کو بیان کرنے میں آگے آگے تھے۔ اس قومی تحریک سے اور زیادہ متاثر ہوگئے۔ ابتدا میں وہ 'فرزند جامعہ عثمانیہ'، 'طالب علم'، 'نوجوان سے خطاب'، 'کسان'، 'نئی زندگی'، اور 'آزادی' جیسی منظومات لکھ چکے تھے۔ جو اس بات کا اظہار تھا کہ ان میں حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ فرزند جامعہ عثمانیہ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

تو مشرق زاد ہے غافل نہ ہو مشرق کے بیٹے سے
سفینے کو بچا طوفانِ مغرب کے تھپیڑے سے

اور آخر میں ؎

ضرورت ہو تو سر بھی نذرِ ناموسِ وطن کر دے
جزاک اللہ تازہ قصۂ دار و رسن کر دے

طلبہ کی کاہلی کو مدِ نظر رکھ کر انھیں نصیحت کی ہے ؎

ترا سازِ عمل خاموش ہے مضراب پیدا کر
یہ رازِ زندگی ہے سیرتِ سیماب پیدا کر
تعاقب میں ترے بجلی کہیں تھک کر چور ہو جائے
ترے قبضے میں آ کر وقت بھی مجبور ہو جائے

اس طرح وحید طلبا کو ملک و قوم کی خدمت کیلئے اکساتے رہے
ان کی ایک اور نظم " طالب علم " میں بھی انہوں نے طلباء کو عمل
کی ترغیب دی ہے ؎

تفریقِ شب و روز کوئی بات نہیں ہے
تقسیم دنا و دن میں کہیں رات نہیں ہے

اس طرح پست ہمت و پژمردہ افراد کے جوش و حیدر بلند تا کو

اجاگر کرنے اور انہیں ٹھیک راستے پر لانے کا مشکل کام ایک شاعر ہی بخوبی کر سکتا ہے۔ وحید نے بھی اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیا ؎

اک تیر کی مانند بلاؤں سے نکل جا
سیماب صفت جلد ہر اک سانچے میں ڈھل جا
بدلی ہے زمانے کی فضا تو بھی بدل جا
مہلک ہے یہاں لغزش پا دیکھ سنبھل جا
ٹھوکر جو لگے راہ میں خاموش نہ چل دے
گر امن کا طالب ہے تو فتنوں کو کچل دے

ان منظومات میں بیانیہ انداز بھی ہے۔ اور خطیبانہ آہنگ بھی۔ وحید کی اس نوع کی دیگر منظومات میں بھی ان عناصر کی فراوانی ہے۔ حالانکہ شعر الگ چیز ہے اور مواعظت الگ چیز۔ ان منظومات کے موضوعات ہی کچھ پند و مواعظت سے ملتے جلتے ہیں۔ وحید نے بھی یہاں شاعری کو پند و نصائح سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ یہ ایک اعلیٰ شاعری کی خوبی ہے جو خطابت میں شاعری کی ترنگ پیدا کر دے۔ نظم "آزادی" کے یہ اشعار ؎

کھلی ہے حریت کی شاہراہیں
غلامی میں پڑے کب تک کراہیں
یہ آزادی کا دستور کہن ہے
نہیں ملتی اگر قیدی نہ چاہیں

اس نظم میں شاعر نے چاہ اور امکان کے رشتہ کو استوار کرتے ہوئے لوگوں میں شعور بیداری پیدا کرتے ہیں۔

سکندر علی وجد نے اپنے دوسرے مجموعہ کلام کو گویا ملک کی آزادی کیلئے وقف کر دیا تھا۔ اس مجموعہ کا نام ہی "آفتاب تازہ" آزاد ملک کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے۔ آفتاب تازہ میں تقریباً ایک تہائی منظومات صرف آزادی و وطن پرستی سے متعلق ہیں۔ ڈاکٹر حامدی کاشمیری کے الفاظ ہیں:

"وجد اپنے دور کے پرآشوب حالات کا شعور رکھتے ہیں۔ لیکن ان کے سماجی شعور میں گیرائی نظر نہیں آتی ان کی چند نظمیں البتہ ایسی ہیں جن میں روح عصر کی جلوہ گری ہے"، ؎۱

؎۱ ڈاکٹر حامدی کاشمیری "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" مجلس اشاعت ادب دہلی ۱۹۶۸ء

"ارادے" "بشارت" "صبح نو" "اندیشے" "آفتابِ تازہ" "جمنا کی فریاد" "نقشِ ناتمام" "نیا دور" "عالم آشوب" "شہر آشوب" "ماحول" "شملہ" اور "عہد آفریں دس سال" منظومات میں روحِ عصر کی کارفرمائی بجا طور پر نمایاں ہے۔ جس میں وطن دوستی کی خوشبو بھی ہے۔ اور شعورِ عصر بھی۔ قومی نظمیں صرف وہی نہیں جن میں ملک و قوم کی تعریف و توصیف کی گئی ہو بلکہ ان منظومات کو بھی اس زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے جن میں وطن سے متعلق کچھ لکھا گیا ہو چاہے وہ تنقید ہی کیوں نہ ہو۔ وحید جیسے منکسر المزاج شاعر سے بھلا کڑی تنقید کی امید کیسے کی جا سکتی تھی، خود وحید کو بھی اس کا اعتراف تھا ؎

آتش مزاج وحید میں اب سرکشی کہاں
وہ خاک پائے اہل نظر بن کے رہ گیا

سنہ ۱۹۴۰ء سے سنہ ۱۹۴۷ء تک ملک کے ہر کونے سے حصولِ آزادی کے نعرے ابھرنے لگے۔ یوں بھی یہ واقعات بہت پہلے ہی سے شروع ہو چکے تھے لیکن لوگوں کا جوش و

جذبہ پروان چڑھتے چڑھتے اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اور ساتھ ہی انگریزوں کا جبر و استبداد بھی عوام کو مولی گاجر کی طرح کاٹتا جا رہا تھا۔ اور قومی رہنما قید و بند کی صعوبتوں کا شکار۔ غرض ملک افراتفری اور بدنظمی کا شکار تھا۔ ایسے میں وجد کی منظومات ہر قدم پر لوگوں کی رہنمائی کرتی رہیں۔ نظم "نیا گیت" میں انہوں نے انگریزوں کی چالوں سے لوگوں کو بخوبی واقف کروایا۔

ساتھی ان سے دور ہی بھاگ　　ان کی ہنسی ہے موت کا راگ
برساتے پھرتے ہیں آگ　　ڈس لیں گے یہ اجلے ناگ

ان کے سروں پر پتھر ڈال
ان کو ہر بستی سے نکال

وجد نے عوام کو نہ صرف انگریزوں کی فطرت سے آگاہ کروایا۔ بلکہ ان کو تحفظ کی راہیں بھی بتلائیں۔ نظم ارادے کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔

غلامی کے اندھیرے میں نظر آتی نہیں منزل
چراغ عزم سے آساں رہ دشوار کرنا ہے

بتانِ سیم و زر پر مرنے والے نوجوانوں کو یا
وطن پر جان دینے کے لئے تیار کرنا ہے!
یہ مانا چند قطرے ہیں لہو کے قلب میں لیکن
بیاباں کو انہی سے سینچ کر گلزار کرنا ہے!

اس طرح پژمردہ دلوں میں جوش و لولہ پیدا کرتے ہوئے وحید ان کے اندر پنہاں امکانات کو نمایاں کرتے تھے۔ تاکہ وہ پھر تازہ دم ہو کر جہدِ آزادی میں حصہ لیں۔ جب ملک میں مجاہدانِ قوم کے مقابلے میں انگریزی حکومت قوی سے قوی تر ہوتی گئی اور انھیں کڑی سے کڑی تر سزائیں دی جانے لگیں تو ان شہیدوں کا وحید کو شدید رنج تھا۔ اس رنج والم کو غلط کرنے کیلئے شاعر نے آنے والے کل کا حسین خواب دیکھا۔ اور نظم "بشارت" میں آج کے پژمردہ چہروں کو کل کی رعنائی و برائی سے آگاہ کرایا ہے

آزادیٔ افکار کے گل دل میں کھلیں گے
یہ خارِ غلامی کی چبھن کل نہ رہے گی

گانے کیلئے قمری و بلبل کو چمن میں
منت کشیٔ زاغ و زغن کل نہ رہے گی
یہ دشمنِ انصاف و کرم ظلم کی دلو کی
بے کس کا لہو پی کے مگن کل نہ رہے گی

سچ تو یہ ہے کہ ان اشعار میں دلبستگی کے جو عناصر مضمر ہیں۔ وہ ہر فتنہ فساد کے موقع پر اکسیر مانے جائیں گے چاہے وہ فرقہ وارانہ فساد ہو یا کوئی اور ہی نوع کا۔ چاہے وہ ہندوستان کا ہو یا پھر دنیا کے کسی بھی ملک کا۔ جہاں بھی ہو ظلم پر مبنی حکومت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔ ظلم و ستم کے طوفان کے بعد ہی رحمت کا نزول ہوتا ہے۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کو زود حس شاعر ہی محسوس کر سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شاعر لسان العصر بھی ہوتا ہے۔ اور مستقبل کا نقیب بھی۔ اس طرح نظم "صبح نو" عوام کے عزم و ارادوں میں استقلال کا عنصر شامل کرتی ہے ؎

راہِ آزادی میں کیا اندیشۂ سود و زیاں
ٹھوکریں کھالو سنبھلنے کا زمانہ آگیا

ہو گیا ہے آگ تپ تپ کر غلاموں کا لہو
اب سلاسل کے پگھلنے کا زمانہ آگیا

۱۹۴۶ء کے آتے آتے انگریزوں کو علم ہو گیا کہ اب ہندوستانیوں کے اندر موجزن ہوا آزادی کو روکنا ان کے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا انھوں نے ایک مخلوط حکومت تشکیل دی۔ جس میں کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ کے نمائندوں کو بھی شامل کر لیا گیا۔ لیکن یہ تجربہ کارگر ثابت نہ ہو سکا۔ نظریوں کی غیر آہنگی نے ہر موڑ پر کشیدگی کھڑا کر دی۔ وحید نے نظم "اندیشے" اسی پس منظر میں رقم کیا ہے ؎

تیزی سے قدم بڑھا مسافر
راستے میں رات ہو نہ جائے

تقدیر سے چال چل رہی ہے
تدبیر کو مات ہو نہ جائے

خورشید کا نور گھٹ رہا ہے
ظلمت کو ثبات ہو نہ جائے

آخر ۱۵ر اگست کو جب ہندوستان آزاد ہوا۔ اور عوام

مرا گلشن بے خزاں لٹ گیا!! | سکوں زا امن واماں لٹ گیا
جو تہذیب تھی سیکڑوں سال کی | وہ گنجینۂ شائیگاں لٹ گیا
دلوں کی سیاہی کی آندھی چلی | اسی میں وطن ناگہاں لٹ گیا
تباہی کا طوفاں ہے چاروں طرف | ہر اک طفل و پیر و جواں لٹ گیا

ایسے فرقہ وارانہ فسادات آئے دن برپا ہوتے رہے۔ اور وحید نے مسلسل ان کے خلاف آواز اٹھائی۔ نظم "عالم آشوب" میں انہوں نے فرقہ پرستانہ عصبیت پر کڑی تنقید کی ہے ؎

مذہب و تہذیب کے فلسفۂ خام سے
شغل فریب عوام دیکھئے کب تک رہے
مضطرب انسان کو امن میسر نہیں
کار جہاں ناتمام دیکھئے کب تک رہے

۱۹۶۹ء میں احمد آباد کے فرقہ وارانہ فتنوں سے متاثر ہو کر انہوں نے نظم "ماحول" لکھی ہے۔ ؎

امن و انصاف کا احسان جتانے والے
آج ہر گام پہ توہین بشر ہوتی ہے

خوشی و سرشاری میں جھومنے لگے تو وحید نے نظم "آفتاب تازہ" لکھی جس کے نام ہی سے امید کی پہلی کرن پھوٹتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ نئے اور آزاد وطن کیلئے علامت ہے ؎

آزاد و شاد و مست غزل خواں ہے زندگی
حسن حیات دیکھنے والا کدھر ہے آج
اک دلنواز خواب حقیقت میں ڈھل گیا
نخل امید اہل نظر بار ور ہے آج
محسوس ہو رہا ہے انوکھا سہانا پن
اک سادہ جھونپڑا ہی سہی اپنا گھر ہے آج

آزادی کے بعد جو فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، اس سے طرب آزادی کا خمار سراب بن گیا۔ حالات نے عجیب کروٹ لی۔ اپنے ہی اپنوں کے دشمن بن گئے۔ قتل و غارت گری اور خون آشامی کے جو واقعات رونما ہوئے، وحید نے بعنوان "جمنا کی فریاد" ایک نظم تحریر کی۔ جو ان واقعات کی بخوبی عکاسی کرتی ہے۔ ؎

کن مراحل سے گذرتے ہیں اسیران ستم
رات زنداں میں تو مقتل میں سحر ہوتی ہے
روز ملتی ہے مہکتے ہوئے پھولوں کو سزا
روز گلشن کی زمیں خوں سے تر ہوتی ہے

اسی طرح سنہ ۱۹۷۶ء میں جب بھیونڈی میں فسادات پھوٹے تو وحید سے برداشت نہ ہو سکا ؎

شہر میں ظلم کے آثار ملے
آدمی نقش بہ دیوار ملے
کوئی آزاد نہیں شاد نہیں
سب مصیبت میں گرفتار ملے

وحید کی نظر ہر چیز کی حسن و خوبی تک جاتی ہے لیکن جہاں تک زشت و قبیح کا تعلق ہے۔ وہ اس سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ریگستانی خاردار پھول میں بھی حسن کے متلاشی ہیں۔ انہوں نے "گہوارۂ مسیح" سفید کیکٹس کے پھول سے متاثر ہو کر لکھی ہے۔ ہیئت و لہجہ میں تو یہ نظم اقبال کے فلسفیانہ نظم "ساقی نامہ" سے

ملتی جلتی ہے۔ اکثر ریگستانی پھول رات میں کھلتے ہیں۔ اور راتوں میں کھلنے والے بیشتر پھولوں کا خاصہ ہے کہ وہ سفید اور خوشبودار ہوتے ہیں۔ ایسے پھول رات کی ابتدائی حصے میں کھلتے ہیں اور دو چار گھنٹوں کی شادابی کے بعد رات کی تاریکیوں کے ساتھ ہی اپنا شباب کھو دیتے ہیں۔ شاعر نے ان پھولوں کے رنگ اور انکی رات میں چٹکنے والی خصوصیت کو پیش نظر رکھ کر اسکو شمع سے تشبیہ دی ہے۔ جو صبح کے ہوتے ہوتے خاموش ہو جاتی ہے۔ دیکھئے ؎

اے شب چراغ تجھ سے منور دل چمن
کھلنے سے تیرے دولت کون و مکاں ملی
پرکیف و دلنواز تبسم کا شکریہ
تری مہک سے میرے قلم کو زباں ملی

سفید ناگ پھنی (کیکٹس) کے پھول کی رعنائی و برنائی کو ذہن میں رکھیے اور وحید کے ان اشعار کا مطالعہ کیجیے

شفاف چاندنی سے بنی ہے تری قبا
ضوبار پتوں میں تری کہکشاں ملی

تاروں کو رشک ہے ترے روئے صبیح پر
تری جلو میں روحِ چمن نغمہ خواں ملی
آغاز ہے شباب کے رنگین دور کا،
تجھ کو حسین شب کی دلہن نوجواں ملی

اب دیکھیے ان حسین گھڑیوں کا کیف ابھی مٹنے بھی نہ پایا تھا کہ اس کی رعنائی و برنائی پر انحطاط کا سایہ منڈلانے لگا اور شاعر کو اس حسین ارمغاں کے چھوٹنے کا احساس ہوا اور بے ثباتی کا شکوہ کرنے لگا ؎

لیکن ترا لباس عروسی کفن بھی ہے
مثلِ حباب کم ہے تجھے عمر رواں ملی
یوں مسکرا کے چھوڑ نہ بزم طرب ابھی
اے ماہِ نو، جوان ہے لیلائے شب ابھی

اب غنچہ دہن مرجھاتے ہوئے فلسفۂ فنا و بقا کو اس طرح بیان کرتا ہے ؎

دن رات ظرفِ وقت میں ڈھلتی ہے زندگی
مٹتی نہیں لباس بدلتی ہے زندگی

ان اشعار سے یہ نظریہ مترشح ہے کہ عالم آب و گِل کے بعد عالم ارواح (برزخ) کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ "زندگی کے لباس بدلنے" والے اس فلسفے سے اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں وحید تناسخ کے قائل تو نہیں ہیں ایسی بات نہیں وہ ٹھیک اسلامی نقطۂ نظر کے قائل ہیں۔ جسد خاکی سے ہٹ کر روح کے لامتناہی سفر کے قائل ہیں دیکھئے اپنے فلسفۂ حیات کی وہ کس طرح توضیح کرتے ہیں۔ ؎

تعبیر جس کو موت سے کرتے ہیں بے خبر
تبدیلئ مقام ہے مرتا نہیں کوئی
دریائے زندگی ہے دمادم رواں دواں
ڈوبے بغیر پار اترتا نہیں کوئی
تصویر کائنات ابھی ناتمام ہے
قدرت کو روز نقش بدلنے سے کام ہے

اس نظم کا لب و لہجہ، طرز ادا، وحید کو اقبال سے قریب کر دیتا ہے۔ خصوصاً ان کا آخری شعر اقبال کے ان اشعار کی

یاد دلاتا ہے۔ ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

اور یہ شعر جہاں اقبال نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے

ہے نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل ؎
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

وجد کی نظم "کاروانِ زندگی" وجد کی طویل ترین اور مایہ ناز نظم ہے۔ اس میں انہوں نے کائنات کے آغاز و ارتقا سے لیکر انسان کے چاند پر جانے تک کے واقعات کو مسدس میں بڑی ہی کامیابی سے نظم کیا ہے۔ اس طویل نظم کو انہوں نے تیس سال میں مکمل کیا ہے ممکنہ حد تک سائنسی نقطۂ نظر سے استفادہ کیا اور مذہبی تصانیف قرآنِ شریف اور رگ وید سے بھی حوالے دیئے ہیں۔

"کاروانِ زندگی" میں وجد نے ابتدائے آفرینش جس کو عدم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بڑی ہی خوبی سے نظم کیا ہے۔ مصرعہ۔

ع فضائے بے فضا میں حرف کن کا انتظار ہے

اس حرف کن کو چاہے قرآنی نقطۂ نظر "نظریۂ کن فیکون" سے تعبیر کریں یا نظریۂ اضافت کے تحت ابتدائی خلل یا پھر پروفیسر فرڈ ہائیل (FRED HOYLE) اور ڈاکٹر جے وی۔ نارلی کر (J.V. NARLIK) کے الفاظ میں بڑا دھماکہ۔ عدم وخلا کی تصویر کشی کیلئے فضائے بے فضا (Space) کے معنی خیز الفاظ کا استعمال وحید کی علمیت اور اہلیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ یکساں بکھرے الکٹران، پروٹان کے درمیانی قوت (قوت کشش و قوت مدافعت) میں جب ابتدائی خلل پیدا ہوتا ہے تو سائنس کے بموجب ان بکھرے جوہروں کا کسی میں انجماد عمل میں آیا جس کی وجہ سے کئی سحابیوں (NEBULAES) کا وجود عمل میں آیا۔ اس افراتفری میں ہر سحاب اندرونی قوت کشش اور بیرونی قوت مدافعت میں افراط پیدا ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہر سحاب دوسرے سے پرے ہٹنے لگتا ہے۔ اور مزید انجماد عمل میں آتا ہے جس کے نتیجے میں ستاروں کی پیدائش

عمل میں آتی ہے ۔ ؎

جنوں میں موجِ برق کا جو رخ ذرا بدل گیا
غبارِ نورِ شعلہ بار سیکروں میں ڈھل گیا
خودی کی جب ہوا چلی تو سب کا دل مچل گیا
کوئی ادھر نکل گیا کوئی ادھر نکل گیا
ابھی چھڑا نہیں ربابِ داستانِ زندگی
عدم کی گرد میں نہاں ہے کاروانِ زندگی

بقولِ رضی الدین صدیقی :

ارتقا میں سحابیوں کے بعد دوسرے نمبر پر ستاروں کی پیدائش ہے۔ پھر جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ستاروں میں کہیں مقامی انجماد ہوکر مادہ علحدہ ہو جاتا ہے۔ ان کو ہم سیارے کہتے ہیں اسی طرح بعد میں سیاروں سے چاند نکلتے ہیں۔ اور پھر سیاروں پر جہاں کہیں دوسرے ارتقائی حالات موافق ہوں یعنی ہوا، پانی، حرارت وغیرہ مناسب شکلوں میں

پائی جائیں تو یکے بعد دیگرے اور بتدریج
جمادات نباتات حیوانات اور آخر انسان
نمودار ہوتے ہیں۔" [1]

اب اس تمہید کے بعد دیکھئے وجد کیا کہتے ہیں ؎

انھیں میں تھی زمیں بھی ایک شعلۂ شرر فشاں
بجھی ہزارہا برس میں مدتوں اٹھا دھواں
یہ رات جب کٹی تو کوہ و دشت وجود ہو گئے عیاں
دیا سمندروں کو آفتاب نے پیام جاں
بنی اسی عمل سے سطح آب کان زندگی
عجیب شان سے رواں ہے کاروان زندگی

اور آگے لکھتے ہیں کہ "گزر گئے امید و بیم کے ہزارہا برس"
اور پھر کہیں رگ نبات میں رواں ہوا نفس" اور پھر زمین پہ
آب حیات فزا کی فراوانی ہو جاتی ہے۔ ع

پیر تند سب لٹا رہے ہیں چہچہوں میں خون دل

---

[1] ڈاکٹر رضی الدین صدیقی" اضافیت" انجمن ترقی اردو ہند۔ دہلی سنہ ۱۹۴۰ء پہلی اشاعت،

اس تدریجی منازل سے ہوتی ہوئی کہیں چل کر زندگی ایک مقام پہنچتی ہے

کھلی ہے مدتوں کے بعد اب زبان زندگی
عدم کے تنکدے میں دی گئی اذان زندگی

افراط زندگی سے جو مسائل پیدا ہو جاتے ہیں اس کے تدارک کے لیے فطری طور پر جو کچھ اُن کو محسوس ہو سکا وحید نے اپنی نظم میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے (Struggale for existence) اور (Use and Dis use) (Survivale of the Fittest) کے نظریوں سے بھی استفادہ کیا ہے

فضائے دہر میں یہاں سرکشی نہ پھل سکا!!
جہاں سے مٹ گیا جو ظرفِ وقت میں نہ ڈھل سکا

اب کاروانِ زندگی اپنے مراحل سے گزرتی ہوئی منازل کے پیچ و خم سے ہوتے ہوئے ایسے مقام پر آتی ہے جسکو

نہیں ہے خوف کچھ بلند و پست و گرم و سرد کا
شعار آدمی بھی مرد ہے نبرد کا

پہنچ گیا پیام چاند کو زمیں کے درد کا
بلند حوصلہ ہے آج ہر خلا نورد کا
نئی فضائیں گامزن ہیں سرخوشانِ زندگی
عجیب شان سے رواں ہے کاروانِ زندگی

لیکن اس عروج کو پہنچنے کیلئے کاروانِ زندگی کو کئی حوادث سے گزرنا پڑا۔ کتنے ہی تاج و تخت کی سرگرمیوں کو دیکھنا پڑا۔ کتنے ہی مصلحین کو پیدا کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ جوہری قوت سے بھی آگاہ ہونا پڑا ؎

خموش مادے میں زور بے پناہ قید تھا
خرد نے اسکو جوہروں کے دام سے رہا کیا
بشر نے سعی و شوق سے یہ راز خاص پالیا
اب آرزو کی انتہا ہے حوصلے کی انتہا
نیا جہاں بنا رہے ہیں واقفانِ زندگی
عجیب شان سے رواں ہے کاروانِ زندگی

اس طرح وجد نے کاروانِ زندگی کی داستانِ حقیقت کو استعار کے پیرائے میں بیان کیا ہے کہ ظ انصاری نے

اس نظم کو " اپنے دور کی اردو شاعری کا ایک اضافہ " قرار دیا ہے۔ لیکن رشید حسن خان کے خیال میں :

" یہ بجائے خود ایک اچھی نظم سہی لیکن یہ وحید کی نمائندہ نظم نہیں۔ بات یہ ہے کہ وحید جذبے کے شاعر ہیں اور یہ نظم اور ایسی دوسری نظمیں دوسری دنیا سے تعلق رکھتی ہیں" ؎۱

اور پروفیسر مسعود حسین خان کے نزدیک :

" وحید بیانیہ شاعر نہیں، اس لئے انہوں نے اس قدر طویل موضوع کیلئے مثنوی کی صنف کو اختیار نہیں کیا ان کی فکر تغزل کے پردے میں جلوہ گر ہے۔ اس طرح کہ مسدس کی ہیئت کو بھی انہوں نے غزل کا درجہ دے دیا ہے۔

اسی لئے اس نظم میں ایجاز و اختصار کی ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جس سے تشنگی

؎۱ رشید حسن خاں ' وحید کی شاعری ' اچھا رشارنے ' وحید شاعر و محقق۔ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی۔

کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔" ؎۱

وحید کی شخصیت اور شاعری میں ایک رومانی کیفیت کی فراوانی ہے۔ شعریت، نغمگی، سرمستی و سرشاری گویا ان کی سرشت میں تھی۔ الفاظ و تراکیب کے استعمال میں بھی وہ محتاط رہے۔ اگرچہ انہوں نے عشق و محبت کو فریب کہا اور نظم "سچی باتیں" میں لکھا ہے۔ ؎

وحید کو معلوم ہے ماہیتِ حسن و عشق
ایک فریبِ خیال ایک فریبِ نظر

لیکن اس کے باوجود ان کے اشعار میں حسن و عشق کی وارداتیں ملتی ہیں۔ بقول مرزا ظفر الحسن:

"وحید نے عشق کیا ہو یا نہ کیا ہو، اس کے ہر شعر میں حسن رچا ہوا اور عشق گھلا ہوا ملتا تھا۔" ؎۲

؎۱ مسعود حسین خاں "وحید شاعر و شخص" مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔

؎۲ مرزا ظفر الحسن "ذکر یار چلے" حسامی بکڈپو مچھلی کمان حیدرآباد مارچ ۱۹۷۹

عشق و محبت کا جذبہ ان کی شاعری کی رگ رگ میں سرائیت
کر گیا تھا۔ اور ان کا عشق روایتی عشق ہونے کے باوجود
خلوص اور قربانی و ایثار کا حامل تھا۔ لیکن وارفتگی و سپردگی
کا احساس ان کے ہاں پر پروانہ کی بہ نسبت شمع کی طرف
سے ملتا ہے۔ یہ رجحان ان کی شاعری کو ہندی شعر و ادب
سے قریب کرتا ہے۔

میرے آنے کی مسرت کو مجھی سے نہ چھپا
کونسی شمع نہیں منتظر پروانہ

پھر حسن کا شہر جھومتا ہے
آواز پہ وجد ہے نوا کی

اسی طرح شباب و خواب کی دنیا میں بھی یہی خیال
ملتا ہے۔

کبھی قبل سحر پورا نہ ہوتا میرا افسانہ!
جھکولے نیند کی موجوں میں کھلتی جان مے خانہ
خوشی سے شمع بنتی زینت آغوش پروانہ
یونہی اکثر چمکتی رات پھر تقدیر غم خانہ

رہی تھی ہم نشیں میرے شباب و خواب کی دنیا

وجد کی پارکھ نظر ہر چیز میں حسن ڈھونڈ لیتی تھی۔ چنانچہ نظم "ایک خط کا جواب" میں انہوں نے لکھا ہے۔ ؎

شعاعِ حسن کو ہر شئے میں ڈھونڈ لیتا ہوں
مرے کلام سے روشن ہے میری خوش نظری

اور ساتھ ہی کسی شئے کے سراپا کو بڑی وضاحت سے بیان کرتے تھے۔ نظم "یاسمیں پیکر" میں پیکرِ حسن کو اس طرح بیان کیا ہے۔ چہرۂ گلگوں، مدھری آنکھوں میں کیفِ شرابِ لالہ فام، مسکراتے ہیں لبوں پہ عکسِ دندان صنوفگن، ہونٹ جیسے پارشبنم گل کی پتی موڑ دے گویا ؎

ہر نفس سازِ تخیل کے لئے مضراب ہے
یاسمیں پیکر مجسم نغمۂ بیتاب ہے

اب دیکھئے آمدِ بہار کا شعر۔

صبا صہبا بدوش آئی نہالانِ چمن جھومے
نہیں صحنِ چمن نقشہ ہے کوئے مے فروشاں کا

پرانے خط دیکھئے کتنے حسین ہیں۔

تختۂ گل ہے پاک خاروں سے
گھر منور ہے ماہ پاروں سے

غسل شبنم سے پھول نکھرے ہیں
(پرانے خطوط) فرش پر یوں خطوط بکھرے ہیں

وحید کی منظومات میں ہر نرالی ادا، اور ہر انوکھا رجحان مستور ہے، ہر قسم کا رنگ و روغن، ترنگ و آہنگ مل جاتا ہے۔ حقائق زندگی، مناظر قدرت، مظاہر فطرت، حسن و عشق کی باتیں گل و بلبل کی حکایتیں۔ قصائص تاریخ و تمدن فنون لطیفہ و مفید فنون غرض ہر چیز کی جلوہ گری ہے۔ وحید کی منظومات طویل سے طویل تر بھی ہیں اور مختصر سے مختصر بھی۔ انہوں نے ہر فارم اور ہر طرز اور ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ وحید کو الفاظ پر پوری گرفت تھی۔ وہ الفاظ کے مزاج دان تھے۔ جیسے بھی چاہیں الفاظ کو شاعری کے سانچے میں ڈھال لیتے تھے۔ انہیں تخلیق فن کے دوران فن کے آداب قوانین و ضوابط کا ہر دم خیال رہتا اور وہ انہیں بڑے ہی سلیقہ سے برتتے تھے انہوں نے روایتی شاعری کو اپناتے

ہوئے بھی اس میں جدت و ندرت کو جگہ دی اور شاعری
میں دوسرے فنون لطیفہ کے مزاج کو سمو دیا۔ الفاظ و خیال
کو تراش خراش کر اور بھی دلکش بنا دیا۔ مترنم الفاظ کو استعمال
کر کے اس کی غنائیت و موسیقیت میں بھی اضافہ کیا۔ اور اسی
طرح ہر طرح اپنے خیال کو کچھ اس طرح نظم کیا ہے۔ کہ خیالی
پیکروں کا وجود ممکن ہو جاتا ہے۔ جو ان کے اشعار پڑھنے
کے بعد ہمارے ذہن پر دستک دیتے ہیں۔

ترقی پسند ادبی تحریک کی وجہ سے اردو شاعری نے اگرچہ ایک نیا اور واضح موڑ لیا تھا۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ اس سے کہیں پہلے حالی اور ان رفقاء کی کوششوں سے اردو شاعری مغرب سے متاثر ہو چکی تھی اور جدید عناصر سے مانوس ہو چکی تھی۔ بڑی بات تو یہ کہ اب نظم نگاری کو فروغ ہو رہا تھا۔ اور ساتھ ہی غزل بھی نیا موڑ لے رہی تھی۔ زندگی کا پیچ و خم کچھ ایسی صورت اختیار کر رہا تھا کہ شاعری میں نظم کا پلہ بھاری ہونے لگا تھا۔ وہ شاعر جو حالی کی اصلاحی کوششوں سے متاثر تھے نظم نگاری کی طرف زیادہ مائل تھے۔ تاہم غزل کہنے والوں کی تعداد

بھی اپنی جگہ تھی۔ شعر و ادب میں حقیقت پسندی اور واقعات نگاری کے باوصف جمالیاتی اقدار سرخرو تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ غزل گو شعراء نے جمالیاتی اقدار کو زیادہ عزیز رکھا تھا۔ وجد اسی دور کے ان شعراء میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ جنہوں نے منظومات کے ساتھ غزلیات پر بھی کافی توجہ دی اور اس کے مخصوص رومانی کیفیات اور جمالیاتی احساسات کو بہر کیف عزیز رکھا۔ ان کی شعری تخلیقات میں سرور و کیف نغمگی و سرشاری، حسن و عشق، نزاکت و نفاست، دلآویزی و گلکاری، کی آمیزش ہے۔ جس کے باعث وہ تخلیقات اپنی شناخت آپ بن جاتی ہیں۔

اورنگ آباد کے شعر پرور خصوصاً متغزل ماحول نے سکندر علی کو وجد تخلص اختیار کرنے اور وجدان کی دنیا میں داخل ہونے کا شوق پیدا کر دیا۔ خود اپنے ایک مضمون "میں اور میرا فن" میں رقمطراز ہیں:

> میں نے اڑتالیس برس پہلے اورنگ آباد میں غزل سے شاعری شروع کی۔[۱]

۱۔ سکندر علی وجد "میں اور میرا فن" ہفتہ روزہ بلٹز ۱۵ر جولائی ۱۹۷۶ء

تغزل و ترنم کو اپنانے والے اس شاعر پر ابتدا میں اسلاف کی مخصوص چھاپ نمایاں تھی۔ انہوں نے نظیر اکبرآبادی انیس اور اقبال کی منظومات کا رس نچوڑ لیا تھا۔ میر و سودا کے عہد سے غالب و انیس تک کی ہر اہم آواز کی بازگشت سے متاثر ہو چکے تھے۔ جس کے نتیجے میں ان کے ہاں ایک نئے اسلوب کی اختراع عمل میں آ رہی تھی۔ جس میں میر کی خودداری و خودپسندی غالب و تفکر و تجسس حالی کی دردمندی و ہمدردی انیس کا تقدس اقبال کی خودی و خودشناسی حفیظ کی رومانیت اور اختر شیرانی کی شوخی و بے باکی کا ملا جلا عنصر پیدا ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری نے بہت جلد قبولیت عام حاصل کر لیا۔ اورنگ آباد کے مشاعروں سے جامعہ عثمانیہ کے حصاروں میں آنے کے بعد انہیں ایک نیا مزاج مل جاتا ہے۔ اس وقت ہم عصروں میں مخدوم نے اپنی سخن طرازی کا باقاعدہ اعلان کر دیا تھا۔ میکش نے شعر و ادب کی ناز برداری میں کما حقہ حصہ لے رکھا تھا۔ ابتدا ہی سے وجد اور مخدوم کے خیالات میں شترگربگی پائی جاتی تھی۔ مخدوم نے تقاضائے

وقت کو پیش نظر رکھ کر رومانی شاعری کے ساتھ ساتھ انقلابی شاعری کی تاسیس رکھی تھی۔ وجد نے اسلاف کے احترام کو اپنا فرض سمجھا۔ اس کے برخلاف مخدوم نے ان سے انحراف کو ہی نصب العین جانا۔ روایت سے شدید بغاوت نے انہیں ترقی پسند تحریک سے وابستہ کر دیا۔ اور غزل کی روایتی ہیئت سے بیزاری انہیں ابتدا میں صرف نظمیں ہی لکھنے پر مائل کیا۔ وجد نے اپنے مسلک کی مجلہ عثمانیہ ۱۹۳۶ء کے اداریہ میں وضاحت کی ہے۔

"جب تک دل میں شاندار ماضی کی یاد تازہ نہ ہو مستقبل روشن نہیں ہو سکتا۔ اسلاف کے کارناموں کو اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کیلئے نہیں بلکہ اپنے جوش عمل کو دوبالا کرنے کیلئے یاد رکھنا چاہیئے۔" [1]

لہٰذا وجد نے غزل گوئی کی روایت کو ترک کرنے کے بجائے

---

[1] سکندر علی وجد "مجلہ عثمانیہ" حیدرآباد ۱۹۳۶ء جلد نہم شمارہ ۳ ۱اداریہ۔

اس کو جدتِ ادا و ندرتِ خیال کی گلکاریوں سے سجایا۔ اور اس میں ایک نیا نکھار پیدا کر دیا۔ ؎

متاعِ سخن کے جواہر سجا کر
نگاہِ خریدار سے کھیلتا ہوں

بقولِ شمس الرحمٰن فاروقی :

"وحید بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں
ان کی غزل میں وہ کیفیت ملتی ہے جسے میں
"استادانہ ٹھسے" تعبیر کرتا ہوں"۔ [1]

اور آگے چل کر وحید کی شخصیت اور ان کی شاعری کے رکھ رکھاؤ اور سلیقہ کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

"سکندر علی وحید اپنے بہترین لمحات میں اس
وقت روایتی غزل کے بہترین اور صالح ترین
نمائندہ کہے جا سکتے ہیں۔ الفاظ محاورہ
و ترکیب کے استعمال میں وہ سارا رکھ رکھاؤ

---

[1] شمس الرحمٰن فاروقی "فاروقی کے تبصرے" شب خون کتاب گھر، رانی منڈی الہ آباد ۱۹۶۷ء

جو صرف پختہ کاری نہیں بلکہ ایک فطری اسلوب کا آئینہ دار ہوتا ہے، وحید کے یہاں موجود ہے" [۱]

ظ انصاری نے بھی وحید کے اس رکھ رکھاؤ اور احتیاط کو اپنے انداز میں یوں بیان کیا ہے :

" وحید نے اپنے شعر کو اندرونی شخصیت کی لہک سے، تہ داری سے، اس کی وسعت، گہرائی اور رنگینی سے محفوظ رکھنے کے سارے جتن کر لیے تب چھاپے کی مشین سے گذرنے کا اہتمام کیا۔" [۲]

ان کی ابتدائی غزلیات باوجود ایک نئے اسلوب کو اپنانے کے روایت کی فرسودہ چھاپ سے بچ نہیں سکیں۔ جس میں گل و بلبل کے نغمے بھی ہیں۔ اور عشق و محبت کے ترانے بھی

[۱] شمس الرحمٰن فاروقی " فاروقی تبصرے " شب خون کتاب گھر رانی منڈی الہ آباد۔

[۲] ظ انصاری " کتاب شناسی " بمبئی اگست ۱۹۷۸ء پہلا ایڈیشن۔

صرف یہی وحید کی کائنات کل نہیں۔ بلکہ انہوں نے حقائقِ زندگی اور اپنے تجرباتِ و حوادثات کو بھی بڑی حد تک غزل میں سمونے کی کوشش کی ما سوا اس کے وحید کی ابتدائی خصوصاً "لہو ترنگ" کی غزلوں میں سطحیت اور کچھ اکھڑی اکھڑی سی کیفیت ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے غزل نگاری کا حقیقی تفکر انہیں ابھی ہاتھ نہیں آیا عبدالوحید نے جدید شعرائے اردو میں لکھا ہے:

"غزلوں میں ایک پھیکا پن ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وحید صاحب غزلیں نظموں کی طرح ڈوب کر نہیں کہتے۔" [۱]

لہو ترنگ، میں بعض ایسی غزلیں بھی شامل ہیں جو میرے بھی پہلے کی معلوم ہوتی ہیں۔ جن میں روایتی انداز کا قدیم رنگ و روغن بھرا ہوا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔ ؎

وصل میں وہ مزا کہاں تھا جو فراقِ یار میں
حیف کٹی نہ زندگی کیوں ترے انتظار میں

[۱] عبدالوحید "جدید شعرائے اردو" فیروز سنز پرنٹرس کراچی

پھر کیسے تھے رشتۂ تقدیر سے
کھل گئے ہم اک جنبشِ تدبیر سے

رہے گا وحید بیانِ عشق کا سدا یکساں
بدلتی جائے گی سرخی فقط فسانے کی

جب سے ٹھکرا دیا نشیمن کو
برق پر مسکرا رہا ہوں میں

دل کی بستی عجیب بستی ہے
یہ اجڑنے کے بعد بستی ہے

وحید کیا معلوم کیا بنتی وہ شے
جو شراب ناب بن کر رہ گئی

ابتدا میں وحید اقبال سے بڑی حد تک متاثر دکھائی دیتے ہیں دوسرے شعرا کی بہ نسبت ان کی غزلوں میں اقبال کا وہی رنگ نکھرا ہوا ملتا ہے، جو بانگِ درا کی غزلیات میں پایا جاتا ہے۔ چھوٹی بڑی بحروں میں مترنم و مسلسل تغزل سے بھرپور غزلیں وہی اپروچ رکھتی ہیں۔ اسکی وجہ یہ بھی ہے کہ وحید خود کو اقبال کے پیروؤں میں شامل کرنا چاہتے تھے

نظر حیدر آبادی نے اپنی تصنیف 'اقبال اور حیدر آباد' میں

اس طرح تحریر فرمایا ہیں:

" اقبال کی شاعری سے وہ (وحید) اس درجہ
متاثر رہے ہیں۔ کہ اقبال کو اگر ان کو روحانی
مرشد کہا جائے تو مناسب ہوگا"۔ ؎۱

اسی تصنیف میں ایک اور جگہ بھی اس کی وضاحت کی ہے:

" اس دور کے شعراء میں فکر اقبال سے قربت
کی سعادت سب سے زیادہ سکندر علی وجد
کو حاصل رہی۔ وحید کی شاعری میں اقبال اسی
مرتبہ پر فائز ہیں جس مرتبہ پر پیر رومی خود
اقبال کی شاعری میں نظر آتے ہیں"۔ ؎۲

چند اشعار جو اقبال کی ترنگ میں رنگے ہو گئے ہیں ملاحظہ
فرمائیں: ؎

؎۱ نظر حیدر آبادی "اقبال اور حیدر آباد" اقبال اکیڈمی پاکستان کراچی ۱۹۶۱

عجب آرزو ہے انوکھی طلب ہے
تجھ سے تجھے مانگنا چاہتا ہوں،

ترے سوا ہے جہانِ الفت کلام بھاتا نہیں کسی کا
تجھے یقین آئے یا نہ آئے یہ راز ہے میری خامشی کا،

قلزمِ ہستی ہے اصلی امتحان گاہِ کمال
بحر کے طوفان کی ہر موج دریا دل نہیں

دل حق نما حق نگر مل گیا
عجب سالک باخبر مل گیا

تھوڑی سی خودی سے گر لے کام
خود شمع پھرے اگر گرد پر پروانہ

نگاہِ منتظر آفتاب تازہ ہے
عروسِ صبح ستاروں کی سوگوار نہیں

زمانہ ہے کہ محو شستشو ہے ایک مدت سے
گلیم فقر سے بوئے جہان بانی نہیں جاتی

لہو ترنگ کی غزلوں سے جو کیفیت مترشح ہے۔ اس سے
وہ جو بھی کما حقہ، واقف ہیں۔ انھیں اس کا اعتراف بھی ہے۔

کہ اس مجموعہ کے اشعار زیادہ تر حسن و عشق کی کہنہ شراب سے لبریز ہیں۔ تاہم فرسودہ ہونے کے باوجود اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتی ہیں۔ لہو ترنگ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

ع ختم غزل سے چھلکتی ہے حسن و عشق کی سے

وجد کی شاعری کا شفوان ہی کچھ ایسے ماحول میں ہوتا ہے جس کو رومانی ماحول کہا جاسکتا ہے۔ ایسا ماحول جہاں ایسی شاعری پروان چڑھ رہی تھی جس میں عشق حقیقی کا رنگ بھی تھا اور عشق مجازی کا آہنگ بھی۔ گویا رومانیت کی فراوانی تھی جو حقیقت نگاری سے قدرے میل کھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس غیر فطری تصادم سے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوسکا۔ یہی وجہ ہے کہ وجد کی شاعری میں حقیقت نگاری کا اتنا دخل نہیں جتنا کہ رومانیت کا ہے ے

اک پرتوِ دلکش ہے خیالوں کے اثر کا
خود حسن حقیقت نہیں دھوکہ ہے نظر کا

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وجد کی شاعری صرف لفاظی یا قافیہ پیمائی ہے بلکہ ان کے بیشتر ابتدائی اشعار میں ان چیزوں کا

فقدان سا تھا۔ جس کا کہ ادب اور زمانے کو تقاضا تھا۔
وحید نے بھی محسوس کیا تھا۔ خود انکے الفاظ میں:

" اس حقیقت کا بھی شدید احساس ہے کہ
یہ شاعری وقت کے حوصلوں ضرورتوں
اور آرزوؤں کی پوری ترجمانی نہیں کرتی " لہ

وحید نے اس کمی کو دور کرنے کی ممکنہ کوشش کی آفتاب تازہ کے سپہر ادب پر طلوع ہوتے ہوتے ان کے اشعار جو ابھی خلوت کدۂ حسن و محبت میں گرفتار تھے۔ دھیرے دھیرے وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینے اور قرب وجوار کے حالات کی طرف مائل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ آزادی کے نعرے بھی وحید کے تنگ نائے غزل میں جگہ پانے لگے۔ وہ صنف جو صرف چنگ و رباب کی محفلوں کے لیے مختص ہو چکی تھی۔ سیاسی وسماجی مسائل کو سلجھانے اور ان کے اظہار کیلئے وحید کے ہاں پہلی بار مستعمل ہوئی چند شعر درج ہیں۔

لہ سکندر علی وجد " اوراقِ مصور" مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر دہلی ۱۹۶۳ء

زندگی خون میں نہائی ہے
لوگ سمجھے بہار آئی ہے

ہم صفیرو کہاں کی آزادی
دام سے تا قفس رہائی ہے

وجد آزادی کے پودے کے لئے
خون سے بڑھ کر پسینہ پیا ہے

ہو رہے ہیں صاف صدیوں کے کھنڈر
مدتوں ہماری رہنے کی توڑ پھوڑ!

فضا میں شور ہے پیہم خوشی کے نعروں کا
تڑپ کے رہ گئی فریاد، دادخواہ کہاں!

حالی کی مخالفت کے بعد غزل کو ایک اور گروہ سے دست و پا ہونا پڑا۔ یہ ترقی پسند تحریک تھی۔ اس تحریک نے ادب کو نہ صرف زندگی کی مادی حقیقتوں اور جدلیاتی واشتراکی قدروں سے روشناس کرایا۔ بلکہ اس کو روبہ عمل لانے کی کوشش بھی کی۔ ترقی پسند شعرا غزل کی بوتلمونی طبع سے اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ لہذا غزل کی مخصوص وضع قطع کو مدنظر رکھ کر اس صنف

احتراز و اجتناب کرتے رہے۔ لیکن غزل کی اوج قسمت تو بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ اور یہیں سے اس کی قسمت میں تابندگی پیدا ہوئی ہے۔ آزادیٔ ہند کے بعد جو خون چکان حادثے رونما ہوئے اور عفریت تعصب کے ظلم و استبداد و سیاسی انتقام کا وہ بازار گرم ہوا کہ انسان تو انسان حیوان بھی شرما جائے وحید جیسا غزل گو شاعر جب ان ناقابل برداشت حالات کا جائزہ لیتا ہے تو اس کے اشعار میں اشارۃً ہی کیوں نہ سہی اس کا تذکرہ آجاتا ہے۔ اب ترقی پسند مصنفین کے آگے یہ عقدہ کھلا کہ غزل ایک ہمہ جہت صنف ہے۔ جس کو کسی ایک جہت کیلئے مختص نہیں کیا جاسکتا۔ تو اب بیشتر ترقی پسند شعراء بھی غزل کی وسعت و ہمہ گیری کے قائل ہوئے، اور نہ صرف غزل گوئی پر مائل ہوئے بلکہ اچھی غزلیں بھی کہیں ان شعراء کی تقلید میں عموماً غزل گو شعراء نے بھی واقعات حیات و کائنات کو ظرفِ غزل میں سمونا شروع کیا یہاں سے جدید غزل کی ابتدا ہوتی ہے۔ وحید کو بھی اب حقیقت نگاری کی سمت مائل ہونا پڑا اس کا اظہار بھی وہ غزل کی زبان میں کرتے ہیں۔ ؎

رخ زندگی سے نقابیں الٹ کر
حقیقت دکھانے کو جی چاہتا ہے

بہلتی نہیں داستانوں سے دنیا
یہاں اب حقیقت نگاروں کے دن ہیں

وجد کی سرکاری و نیم سرکاری مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ وہ اور شعراء کی طرح ہمہ وقت شعر نہیں کہہ سکتے تھے اس کا انھیں احساس بھی تھا اور اعتراف بھی۔ اوراقِ مصور کے دیباچہ میں اپنی شاعری کے بارے میں رقمطراز ہیں۔

"یہ نہایت پابند اور مصروف زندگی کی پیداوار ہے"۔ [۱]

تاہم انہوں نے زندگی کے ہر موڑ پر شاعری اور بالخصوص غزل کا ساتھ دیا۔

رہا عمر بھر وجد رسیا غزل کا
محبت کے نغمے کو پائندگی ہے

غزل کو وہ ہر دلعزیز صنف کہتے ہیں۔ اور اپنے اشعار میں جہاں تہاں اس سے والہانہ لگاؤ کا اظہار بھی کیا ہے۔ اور بڑے سلونے اور بڑے ہی دلکش انداز میں یہ شعر۔

---

[۱] سکندر علی وجد' اوراقِ مصور' مکتبہ جامعہ لیٹیڈ دہلی ۱۹۶۲ء پہلی اشاعت۔

وجد اردو کی آبرو ہے غزل
یہ نوازش ترے وطن کی ہے

انہوں نے غزل کی ہمہ جہت خصوصیت کا کما حقہ لحاظ رکھا اور اس کے دامن میں متنوع موضوعات کو جگہ دینے کی کوشش کی ہے۔ ؎

وہی دراصل غزل ہے جس میں
تیغ و پازیب کی جھنکار ملے

شاعری کو وہ جذبۂ تخلیق کی رونمائی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ لیکن وہ غزل نشاط و انبساط کے لئے کہتے تھے۔ چنانچہ اوراقِ مصور کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"میرے لئے شاعری جذبۂ تخلیق و اظہار کی تسکین کا سامان ہے۔" ؎۱

آگے میں اور میرا فن میں رقمطراز ہیں:

"میں غزل اپنے شوق اور نشاطِ خاطر کیلئے کہتا ہوں۔" ؎۲

۱؎ سکندر علی وجد "اوراق مصور" مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر دہلی۔

۲؎ " " "میں اور میرا فن" ہفت روزہ بلٹز بمبئی ۱۵ اپریل [illegible]

وجدنے غزل کو سدابہار صنف سخن کہا ہے۔ جو ہر وقت ہر ماحول اور ہر معاشرے میں حیات و کائنات کا ساتھ دیتی ہے ہر ظرف میں ڈھلتی اور ہر رنگ سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔ ہر قسم کے فکر و فن کو آغوش میں لیتی ہے۔ ان کے چند اشعار جو خود ان کے مسلک کے نمائندہ اور تغزل کی چاشنی میں لبریز ہیں درج ہیں۔ ؎

آتش کدۂ دل سے رواں موج سخن ہے
ہر شعر شرارہ ہے مرے خون جگر کا

جس طرح موج صبا راہبر نکہت گل
وجد نسبت ہے یہی شعر کو الہام کے ساتھ

جب سے حرفِ وفا دل پہ نازل ہوا
شاعری زندگی کی زباں بن گئی

تخیل کو تکلم دینے والے
غزل عکس رخ جاناں نہ ہو جائے

فکر کی آگ میں تپتا ہے سخن
حرف پر سوز دعا ہو جیسے

ہر غزل میں یہی محسوس ہوا
میں نے کچھ ان سے کہا ہو جیسے

شمال ہے غزل کی تازگی میں
خوبی ترے لعل بے بہا کی

وحید کی غزلوں میں سادگی اور پرکاری دونوں خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ سادگی بھی ایسی کہ جس پر ہزار تکلف نثار ہو جائے۔ ابہام وابلاغ کے مسائل گویا یہیں ہی نہیں، دیکھیے سروں، مترنم بحروں اور سیدھی سادھی عام فہم زبان میں تخیلات کو متغزل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشعار اکثر سہل ممتنع کے زمرے میں آ گئے ہیں۔ بقول پروفیسر رفیعہ سلطانہ ان کی غزل:

"تخیل کے ذریعہ امکانات کی از سر نو تعمیر کرتی اور داخلی طور پر انسان کو بدلنے میں مدد دیتی ہے۔" ؎۱

ڈاکٹر مغنی تبسم کا خیال ہے۔

"وحید نے جہاں الوا، اجلتا تاج محل جیسے

؎۱ رفیعہ سلطانہ "فن اور فنکار" مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد ۱۷ نومبر ۱۹۶۱ء

مظاہر حسن پر خوبصورت نظمیں لکھیں ہیں
وہاں اپنی غزلوں میں داخلی احساس اور
ماورائی کیفیات کو ٹھوس پیکروں میں ڈھال
دیا ہے"۔ [1]

یہ ٹھوس پیکر ان کے تخیل کی تخلیقات ہوتے کے علاوہ حیات و
کائنات کے اثر و رسوخ سے متاثر ضرور ہیں۔ اسی لئے ہمیں
یہ پیکر مانوس لگتے ہیں۔ سادگی و پرکاری نے رنگ غزل
کو اسقدر سلجھا دیا ہے کہ شعر فوراً زبان زد ہو جاتے ہیں۔
الفاظ کا الٹ پھیر اس خوبی سے کیا ہے کہ شیرینی و شگفتگی
دونوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان کے
تصورات الفاظ سے جھانک رہے ہوں۔ چونکہ وجد کو
زبان بیان اور فن پر غیر معمولی قابو حاصل ہے۔ اسلئے ان کی
شاعری میں روکھا پن نظر نہیں آتا۔ فصاحت کا اندازہ ان کے
ہر شعر سے کیا جا سکتا ہے۔ ان کے یہاں الفاظ نگینوں کی
طرح جڑے ہوئے ہیں۔ خواہ موضوع کیسا بھی کیوں نہ ہو۔

---

[1] ڈاکٹر مغنی تبسم "اپنی بات" سب رس ماہنامہ حیدرآباد نومبر دسمبر ۱۹۸۲ء

شعر کو روانی سلاست سے خوب نکھارا ہے۔ یہیں شاعری

ساحری بن جاتی ہے۔ ؎

جانے والے کبھی نہیں آتے — جانے والوں کی یاد آتی ہے

یوں ہی بے بس نہیں دل کے ہاتھوں — تو بھی مجبور نظر آتا ہے

اپنا بنالے دنیا کو لیکن — جیسی ہے دنیا ویسا نہ بن جا

راز حقیقت کون بتائے — کھو جاتا ہے پانے والا

موت کتنی ہی شاندار سہی — زندگی کا مگر جواب نہیں

سخت حالات کے اندھیرے میں — وقت سے زور آزمائی ہے

اس سے قطع نظر وحید نے جہاں فارسی تراکیب استعمال

کئے ہیں ان کے ہاں تھوڑی اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

شاذ تمکنت نے وحید کے ہاں فارسی تراکیب کے بارے میں

لکھا ہے:

"وحید ایک طرف فارسی تراکیب کے دلدادہ

ہیں تو دوسری طرف سہل ممتنع کی طرف راغب ہیں۔" [۱]

---

[۱] شاذ تمکنت "بیاض مریم تنقید و تبصرہ" روزنامہ سیاست

حیدرآباد ۱۷ مارچ ۱۹۷۶ء۔

یہ درست ہے کہ فارسی تراکیب نے ان کے اشعار میں
خوشنمائی ضرور پیدا کی ہے لیکن بعض اشعار میں
اضافت کے استعمال نے شعر کی روانی کو متاثر کرتے ہوئے
ایک شعر اوسا پیدا کر دیا ہے ؎

غبار رند ہے یا خاکِ ساقیٔ مہوش
ادب سے چوم کے ہر ساغر سفال کو دیکھ
گدائے حسن ترا فن گر سوال نہیں
نگاہِ شوق میں رعنائیٔ سوال کو دیکھ

اسی قبیل کا ایک اور مصرعہ ہے ؎

کس قدر زور ہے یہ نشۂ صہبائے بہار

وحید کی غزل میں رومانیت اور کلاسکیت کا ایک حسین
امتزاج ملتا ہے۔ رومانیت دراصل کلاسکیت اور اس کے
بندھے ٹکے قواعد و ضوابط کے خلاف بغاوت کی شکل میں
رونما ہوئی لیکن وحید نے ان دو متضاد حسینوں کو یکجا
کر کے بڑی رنگینی پیدا کر دی ہے۔ انہوں نے کلاسیکی اسلوب
کو اپنایا اور پھر اسکو رومانیت کے ساتھ خوش اسلوبی سے

ہم آہنگ کر دیا۔" اوراق مصور" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

" میں نے اظہار خیال کیلئے کلاسیکی
اسلوب منتخب کیا ہے۔" ؎۱

لہٰذا ان کے یہاں کلاسیکی طرز تحریر میں رومانی اشعار بڑی خوبی سے رچے بسے معلوم ہوتے ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے لکھا ہے :

" انکی غزل میں رومانیت کے ساتھ
حقیقت نگاری کا پرتو بھی موجود ہے"۔ ؎۲

ان کے تقریباً ہر عہد کی غزل رومانیت کی لذیذ چاشنی سے مخمور ہے۔ جس میں حسن و عشق کے علاوہ فطرت کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ ان کی غزلیات میں جہاں کلاسکیت کا رنگ کچھ گہرا ہے وہاں بیشتر منظومات رومانیت کے آئینہ دار ہیں بقول ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید :

؎۱ سکندر علی وجد " اوراق مصور" مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی سنہ ۱۹۶۳ء پہلی اشاعت

؎۲ پروفیسر عبدالقادر سروری " اردو کی ادبی تاریخ "، شیخ محمد عثمان اینڈ سنس، جولائی ۱۹۵۶ء دوسرا ایڈیشن۔

"کلاسیکی شاعری انفرادی جذبات و
احساسات کو رد کرتی ہے جبکہ رومانی
شاعری میں انفرادیت ہی سب کچھ ہے
بلکہ رومانیت کا دوسرا نام انفرادیت ہے" ؎۱

وحید کے ہاں چونکہ دونوں کی آمیزش ہے۔ اس لئے
ان کی غزلیات میں انفرادی تجربات بھی ہیں اور اجتماعی
کوائف کائنات بھی۔ ان کا رومانی شعور کلاسکیت کے جلو
میں پروان چڑھتا ہے۔ ان کی شاعری میں فطرت کی عکاسی جا بجا
یوں ملتی ہے کہ انہیں شاعر فطرت سے موسوم کیا جاسکتا ہے
خود انہوں نے کہا ہے ؎

اکثر شب مہتاب میں وہ شاعر فطرت
سرگرم سخن بزم سخنداں میں ملے گا

اور اب ان اشعار کو دیکھئے ؎

مسکراتے ہیں پھول کانٹوں میں
ہائے کیا طرز دلربائی ہے

۱؎ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید "تنقید شعر" نیشنل بک ڈپو چار کمان حیدرآباد ۱۹ء

جن کی آنکھوں میں تھا سرور غزل
ان غزالوں کی یاد آتی ہے

کہیں موسم بہاراں کہیں زندگی غزل خواں
ترے حسن کی بدولت مرے شعر کے اثر سے

اس تکلف سے کھلا غنچۂ دل
غنچۂ بند قبا ہو جیسے

وہ چہرہ منور وہ آنکھیں شرابی
شب ماہ میں پھول جیسے کنول کے

دلکشی رنگ پیرہن کی ہے
گل میں خوشبو ترے بدن کی ہے

وحید رجائیت پسند ہیں۔ ان کا مسلک اپنے قدر دانوں کو شریک عیش کرنا ہے۔ وہ خود جینا اور قارئین کو جینے کے مواقع فراہم کرنا چاہتے تھے۔ میر کی سادگی کو تو وحید [illegible] ور اپنایا لیکن ان کے ہاں " ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے " جیسے قنوطی طرز نگارشات کا فقدان ہے۔ غم واندوہ کے پہاڑ بھی کیوں نہ ٹوٹیں رجائیت انھیں رونے سے باز رکھتی ہے۔ غم کو خوشیوں کا

پیش خیمہ سمجھتے ہیں اور نشاطِ غم و سرور الم سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے بازار جہاں میں خوشیوں کی ارزانی کو مدنظر رکھ کر غم کو گنج گراں بہا ثابت کیا تھا بجائے زندگی میں وحید کو کسی قسم کی الجھن نہیں تھی خوشیوں کی بیکراں وسعتیں ملیں لیکن ریست ور ما نے کے مطالعے سے انہیں غم و اندوہ کی اصل قیمت معلوم ہوئی مگر یہ غم نشاط آور ہے۔ لذت بخش، وجہ سرشاری ہے اور سب کچھ۔ ہ

اس غم کی فضا میں نغمہ زن ہوں
جس غم نے مجھے خوشی عطا کی

اسی لطف سے وحید سرشار ہے دل
خوشی دینے والے نے غم دے دیا ہے

خوشی ارزاں ہے بازار جہاں میں
بہائے غم متاع جان و تن ہے

تصوف اور فلسفہ دو ایسی چیزیں ہیں جو ابتدا ہی سے غزل کے لئے لازم سی ہوگئی ہیں لیکن دور جدید کے شعرائے نے بڑی حد تک ان چیزوں سے اپنا دامن چھڑایا ہے۔ وحید نے

اپنے چند ایک اشعار میں فلسفے کی چاشنی بھر دی ہے وہ فلسفی تو نہیں لیکن انہوں نے شاعر ہونے کے ناطے بڑی حد تک حکمت اور فلسفے کو پیکر سخن میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے ان کی ابتدائی غزلیں ایک حد تک روایت پرستی کے آئینہ دار سہی ان میں پائے جانے والے جو باتیں پہامولی ہیں ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ان کی کوتاہ بینی تو نہیں بلکہ ماحول کی تاثیر ہے اگر فضا میں بادۂ کہن کی سی کیفیت ہو تو کیا عجب ہے کہ اشعار سے وہ رنگ چھلکنے لگے کیونکہ

ع فضا آئینہ دار فکر و فن ہے

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی کے الفاظ میں :

"غزل روایتی روش سے ہٹ کر بھی اپنا وجود قائم رکھ سکتی ہے۔ اس کے اندر حکیمانہ مضامین کی تلاش بھی ممکن ہے۔ وحید روایات کو اپنانے کا اعتراف بھی کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کے احساس جمال سے زیادہ ہم آہنگ ہیں لیکن وحید کی غزلوں سے حکیمانہ مضامین کی تلاش فضول ہے"۔[1]

[1] صفی الدین صدیقی "شخصیت اور فن سکندر علی وجد" روزنامہ سیاست حیدرآباد ۱۹۶۷ء

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی کے اس قول کے باوجود وحید کی غزلیں لفاظی یا قافیہ پیمائی نہیں بلکہ معنی آفرینی کی دلیل ہیں۔ چنانچہ غزلوں میں فلسفے کے پیچیدہ و مشکل مسائل کو وحید نے سادہ اور سلیس زبان میں جس خوبی سے پیش کیا ہے وہ اپنا جواب آپ ہے۔ اگر ان کے شاعرانہ مزاج میں فلسفیانہ تفکر و تصوفانہ جذبات کی فراوانی نہیں تو کم از کم عمیق اخلاقی قدریں سبق آموز و سبق آمیز مسائل ضرور پائے جاتے ہیں

ایک ہی ذات ہے موجود زماں ہے نہ مکاں
دیکھنے کو یہ طلسم مہ وساں اچھا ہے

ساحل کی تلاش ناخدا کو
طوفاں کو تلاش ناخدا کی

کل تک جسے تیری جستجو تھی
آج اس کو خود اپنی جستجو ہے

جہاں حد ہے احساس اور آگہی کا
وہاں تک خودی ہے وہاں سے خدا ہے

مسلسل رواں وقت کا قافلہ ہے
کوئی آرہا ہے کوئی جارہا ہے
علم نے یوں تو بہت عقدۂ مشکل کھولے
راز گنجینۂ فطرت کے نہاں اور بھی ہیں

وحید کی غزل میں سرمستی و سرشاری، حسن و لطافت، شباب و شراب کی کیفیت، رنگینی و دلکشی، جذبات و صفائی، شگفتگی و تازگی، طربیہ و نشاطیہ کوائف غرض ہر خوشنما عنصر کی آمیزش ہے۔ پروفیسر مسعود حسین خان بھی اسی خیال کے حامل ہیں کہ وحید:

"تغزل کے فن کار ہیں اور ان کا فن لفظوں کی مینا کاری سے آگے نہیں بڑھ سکا وہ شعریت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اسلئے کہ تخلیق شعر میں سپاٹ ہونے سے بہت جھجکتے ہیں۔" [۱]

وحید کی غزلوں میں بادۂ کہنہ کا مزہ بھی ہے اور حال کا دل گداختہ پن بھی۔ انہوں نے بڑی مشاطگی سے غزل کے

[۱] مسعود حسین خاں "وحید شاعر و شخص" مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی ۱۹۸۹ء

گیسو سنوارے ہیں۔ اشعار میں کیف و اثر کی ملی جلی چاشنی بھی ہے اور وارفتگی و سپردگی بھی۔ ان کے کلام میں زندگی کے وسیع و وقیع حقائق بھی ہیں۔ اور پیش پا افتادہ کوائف بھی ایسا لگتا ہے جیسے اردو زبان میں بادۂ حافظ کا مزہ دیتے ہیں جیسا کہ عصمت جاوید کہتے ہیں:

"ان کے کلام میں احساس کی دبی دبی اور دھی آنچ کے ساتھ خیال کی نفاست لفظوں کی شائستگی اور لہجے کی شگفتگی ملتی ہے۔ ان کا لہجہ مجموعی طور پر نشاطیہ ہے سچ تو یہ ہے کہ ان کا کلام حافظ شیرازی کی یاد دلاتا ہے۔" [۱]

وحید نے بادۂ حافظ کی دوکان کھولی ہے
غزل معجزۂ حسن بیاں ہے اے دوست

اب دیکھئے وحید نے کس طرح اپنے مطمح نظر کی وضاحت کی ہے

شعر کے پردے میں راز زندگانی فاش ہو!
صرف لفظی شاعری کا وحید میں قائل نہیں

[۱] عصمت جاوید "وحید شاعر و شخص" مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی ۱۹۸۲ء

سچ تو یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں وہ کیفیت ہے جو بقول خواجہ احمد فاروقی میر کے کلام میں پائی جاتی ہے تزئین کلام کیلئے وجد نے صنائع لفظی کی بہ نسبت صنائع معنوی سے کام لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ صنائع کے استعمال کے گر سے بخوبی واقف ہیں۔ لہٰذا فصاحت کے شرائط و بلاغت کے لوازمات میں کہیں کوئی خلل پیدا نہیں ہوتا۔ اب دیکھیے حسن تعلیل کی صنعت کس سلیقہ سے مستعمل ہے ؂

؂ صبا نے دیر تک چوما ہے شاید
چمن میں عارض گل پر نمی ہے

؂ خندہ زن صورت گل دامن صد چاک سرا
پیرہم فصل بہاری ہے تجھے کیا معلوم

؂ فیض غم آشنا نگاہوں کا
سرخوشی بادہ کہن کی ہے

شاعر نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کسطرح استفسار کیا ہے ملاحظہ ہو

نشان شمع محفل ہے نہ تھا کے اہل محفل ہے
سحر اب پوچھتی ہے رات پروانوں پہ کیا گزری

صنعت تضاد کے استعمال کو دیکھئے

تکلّم کا جوہر عیاں کر دیا
خموشی نے جادو بیاں کر دیا

نگاہ اہل گلشن کہہ رہی ہے
خزاں جائے بہار آئے نہ آئے

یوں تجھے یاد کیا کرتا ہوں
تو مجھے بھول گیا ہو جیسے

صنعت لف ونشر کی مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

تمیز خواب و حقیقت ہے شرط بیداری
خیال عظمت ماضی کو چھوڑ حال کو دیکھ

نگاہ وقت میں تفریق ماہ وسال نہیں
سراب گردش شام وسحر ہے کیا کہئے

صنعت مراعات النظیر کی مثالیں بھی دیکھئے ؎

ہجوم جلوہ بڑا ملال ادائے خود بینی
نگاہِ صبر سے آرائش جمال کو دیکھ

ہواؤں میں پیام برہمی ہے
گھٹاؤں کا سفینہ ماتمی ہے
آگہی اپنی خطا ہو جیسے
بے بسی اس کی سزا ہو جیسے

اب دیکھئے ان کا طرزِ تعجب ؎
غلامی کی میعاد کم کرنے والو!
بڑھا دی غلامی کی میعاد کیسی

فشائے راز میں کتنی بخیل ہے فطرت
حقیقت ایک بھی ذرے کی آشکار نہیں

ان کی بیشتر غزلیں ان تمام التزامات سے معمور ہیں
جو کلاسیکی شعرا کے کلام میں پھیلی ہوئی ہیں جیسے گل وبلبل
قفس و آشیاں برق و باراں، بھنور و کشتی، ساحل وطوفان
گلچیں وصیاد، دیر وحرم، کعبہ وبت خانہ، مے و میکدہ،
شاہد وساقی، قیس وفرہاد، ہجر ووصال، محمل ولیلا کارواں
قافلہ، منزل وجادہ وغیرہ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار
ملاحظہ ہوں:

محاکات نگاری کے لئے دیکھئے ؎

چمن میں گر میری لئے میں بلبل بیاں کرے درد اپنے جی کا
گلوں کے دامن ہوں پرزے پرزے تو خون ہو دل کلی کلی کا

قفس میں یاں نشیمن کی خاطر نہ تڑپیں
یہ بے بسی اسیروں کی بے داد کیسی

جب سے ٹھکرا دیا نشیمن کو
برق پر مسکرا رہا ہوں میں

عاشقاں ہجر برا ہے نہ وصال اچھا ہے
حسن جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

فصل گل جوشِ جنوں حسرت پرواز چمن
مرغ پابند قفس بے پر و بال اچھا ہے

ساحل سے موج روٹھ کر واپس چلی گئی
دیوانہ وار دولت طوفاں لیے ہوئے

محبت ہی جادہ محبت ہی منزل
یہی ابتدا ہے یہی انتہا ہے

میں تو مئے خوار ہوں ساقی تو کیوں
نشے میں چور نظر آتا ہے

کئی مرتبہ دل پہ بجلی گری ہے
مگر مسکرانے کو جی چاہتا ہے

طوفاں کی خبر دینے والے اندازۂ طوفاں کر سکتے
کشتی کی تڑپ تھی پیش نظر موجوں کا نظارہ کیا کرتے

کوئی دیر و حرم کے درمیاں آواز دیتا ہے
خدا کی آزمائش ہے صنم کی آزمائش ہے

جن شعراء نے غزل کو ذات کے حصار سے نکالکر
کائنات کے نشیب و فراز سے روشناس کرایا۔ ان میں وجد
کی بھی بڑی اہمیت ہے وجد نے جو کہا ہے

کوئی مسکراتا ہوا جا رہا ہے
زمانے کی رفتار کا رخ بدل کے

اب غزل زندگی کے ساتھ ساتھ چلنے لگی جس کی
بدولت شاعری غور و فکر کی اور زیادہ حامل ہو گئی۔ فرد بھی
ماضی کے مقابلے میں اب نسبتاً زیادہ غور و فکر سے کام لیتا ہے

حسن و قبیح کی اصلیت کو پہچاننے کیلئے فرد کو دنیاوی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کام میں اس کا انہماک بڑی اہمیت رکھتا ہے اسلئے اب وہ لغو باتوں سے محترز ہو گیا۔ ؎

زمانے کو فرصت نہیں گفتگو کی!
عروس سخن پہ استادوں کے دن ہیں

اور جب اتنی لگن کے بعد اس کو پتہ چلا کہ دنیا کا دستور ہی ایسا ہے کہ یہاں پہ روز و شب ہنگامے ہوتے رہیں گے۔ ؎

دم بدم رنگ بدلتا ہے جہاں
ہر قدم پہ زندگی کا ایک موڑ

اور یہاں راستے نشیب و فراز کے علاوہ خارزار بھی ہیں۔ ؎

رہ حیات سراسر بھری ہے کانٹوں سے
قدم قدم پہ مصیبت ہے آدمی کیلئے

آئے دن رونما ہونے والے حوادث و مسائل پر غلبہ پانے کیلئے انسان کو اور بھی سوجھ بوجھ سے کام لینا پڑتا۔ اب شاعر اپنی پچھلی زندگی کی فرسودہ حکایات کو یاد کرتے ہوئے

طنزیہ انداز میں کہتا ہے۔

کہیں فکرِ دنیا کہیں فکرِ عقبیٰ
کہاں آگئے میکدے سے نکل کر

اگرچہ 'تلخ است شعر شیریں دارد' کے مصداق انسان
کا یہ تفکر رائیگاں نہیں ہوا بلکہ اسکو آسمانوں پر لے اڑا۔

آدمی کو کہاں لے چلی ہے
توسنِ فکر کی برق پائی

وحید نے آگے چل کر یہ بھی کہا۔

کوئی خورشید جہاں تاب سے اتنا کہہ دے
بزمِ ہستی میں کئی شعلہ بجان اور بھی ہیں

وحید کی اپنی شاعری کا مقصد، نہ کوئی سیاسی انقلاب
ہے نہ سماجی اصلاح۔ لیکن چونکہ ان کا ادبی مسلک،
'فن برائے فن' بھی نہیں۔ ان کی اکثر غزلوں میں 'ادب برائے
زندگی' کا وہی پاکیزہ تصور ملتا ہے۔ جو آزادی کے بعد جدید تر
غزلوں میں رونما ہو چکا تھا۔ بڑی ریاضت کے بعد
اب غزل کو ارضیت نصیب ہوئی تھی۔ وہ غزل جو گل و بلبل کے

استعاروں سے انسان کے دلی کوائف کی ترجمانی کرتی رہی
اب عام فہم مانوس الفاظ میں ادا کرنے لگی۔ رمز و ایما کا جو
چلمن پڑا تھا۔ اس کو نئے انداز سے مزین کیا گیا پرانی اور
نئی تشبیہات، واستعارات، تلمیحات اور محاکات کے
درمیان جو خلیج بنی ہوئی تھی اسکو بڑی حد تک دور کیا گیا
اب واقعات بڑے ہی سلیقہ وسادگی سے پیش کئے
جانے لگے۔ الفاظ کی دروبست کو حسین اور خوشگوار انداز میں
استعمال کیا جانے لگا۔ پرانے تلازموں کی جگہ روزمرہ کے
کے الفاظ اور نئے تلازمے مستعمل ہونے لگے۔ دن،
رات، اندھیرا، اجالا، سورج، چاند، شام، سناٹا،
تنہائی، چراغ، ہوا، دھوپ، آواز، گھر، دریچہ،
کمرہ، دروازہ، دستک، سڑک، راستہ، دھند، دھواں،
چہرہ، سایہ، پرچھائیں، درخت، پتا، ٹہنی، فصیل،
حصار، سمندر، بادبان، جزیرہ، ابر، پتھر، خاک،
ریت، راکھ وغیرہ جیسے الفاظ غزل میں نئی معنویت
اور ابلاغ کے ساتھ مستعمل ہونے لگے۔ وحید کے یہاں بھی

ایسے اشعار کی کمی نہیں۔ جن میں جدید غزل کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ جیسا کہ پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں۔

"ان کے موضوع، ان کی تشبیہیں، اور
استعارے ان کی شاعری کو ایک نیا
آہنگ بخشتے ہیں۔" [۱]

اس ضمن میں ان کے چند اشعار پیش ہیں۔

شبِ جہل و ظلمت ہوئی ختم آخر
اجالے میں تھرا رہے ہیں دھندلکے

پھر حسن کا شہر جھومتا ہے
آواز پہ وجد سے بے نوا کی

چمک رہا ہے بڑی شان سے نیا سورج
کئی مقام ترستے ہیں روشنی کیلئے

مبارک تجھ کو اے سروِ خراماں
جوانی دھوپ جیسے دوپہر کی

وجد عالم تھا عجب حسن کی حیرانی کا!
میں نے دستک جو نہ دی پردۂ محمل کے قریب

---

[۱] پروفیسر عبدالقادر سروری "اردو کی ادبی تاریخ" شیخ محمد عثمان اینڈ سنس ۱۹۷۵ء دوم

ذرا گھر سے اے وحید باہر تو نکلو!

سرِ راہ دلکش نظاروں کے دن ہیں

وحید کی غزلوں میں [illegible] کے پہلو تو ہیں [illegible]

حیات و مسائلِ زندگی کی تصاویر بھی ملتی ہیں۔ غزل کی قطرہ میں جو قیامت خیز طوفان پنہاں ہے۔ اس کی بھی انہوں نے پردہ دری کی۔ ان کے اشعار میں سائنسی، تاریخی، تمدنی، سماجی اور سیاسی ہر موضوع کی ترجمانی ہوتی ہے۔ اور جدید انکشافات کے پرتو بھی ملتے ہیں۔ دورِ جدید کے ہر تقاضے کو انہوں نے اپنی شاعری کے پردے میں جس خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ اس کا جواب بہت کم ملتا ہے۔ تسخیرِ فطرت و کائنات کے علاوہ سائنس کی ترقی انسانی کامیابی و کامرانی زندگی کے مسائل اور ان کے حل یہ سب ان کے موضوعِ سخن رہے۔ وہ خورشیدِ جہاں تاب کی تابناکی کو مانتے ہیں۔ لیکن انسان کے اندر موجود قوتِ تجسس، عزم و استقلال، ایجاد و اختراع، امید و امنگ انسان کو سورج سے بھی زیادہ تابندہ کرتے ہیں۔ ؎

منچلے مہ نوردوں کی ہر جستجو
چاند پر دلنشیں کہکشاں بن گئی

دلکشا معرکے حل طلب تجربے
زندگی گرد صد کارواں بن گئی

ڈرا سکتے نہیں خونی اندھیرے
نگاہ بے دلاں ظلمت شکن ہے

اپنی دنیا سے الگ اپنے زمانے سے جدا
حیرت انگیز مکاں اور زماں اور بھی ہیں

آج کے انسان کی ہمہ جہت ترقی کو دیکھ کر وحید کہتے ہیں۔ ۵

ہر گام پہ گل کھلا رہی ہے
گلشن میں شرارتیں صبا کی

شعر و ادب کے میدان میں علی گڑھ تحریک ترقی پسند تحریک حلقۂ ارباب ذوق نئی شاعری جیسے مختلف تحریکیں رونما ہوئیں۔ ادب برائے ادب ادب برائے زندگی کی آویزش ہوتی رہی۔ لیکن وحید نے اپنے آپ کو ایسا شاعر ثابت کیا جس کو کسی حلقۂ ادب سے الحاق کی ضرورت نہیں۔ ان کے

بموجب فکروفن آزادی ہی میں پھلتے پھولتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اپنی انفرادیت کو بچائے رکھا۔ وہ ہر گروہ کی خوبیوں سے مستفید ہوئے لیکن کسی کی زد میں نہیں آئے۔ ۵

بچاؤ اپنے نشیمن کا وحید خوب کیا
جو بجلیوں کے مقابل بنا دیا تو نے

وحید کے طرز خاص میں جو غزلیں ان کے مجموعہ ہائے کلام میں موجود ہیں ان کا رنگ و آہنگ بقول رشید حسن خاں:

" ہر مصرعہ میں واقعتاً یا دول کا چراغاں ہے۔
کسی گلبدان کے تصرف سے اشعار مہکتے ہیں
اور ان کو پڑھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ دیکھ ان سے
کہا ہو جیسے ' یہ صداقت اور تکلف سے بیری
یہ انداز ان کے اشعار میں تاثیر اور دلکشی
پیدا کرتا ہے یہ بات ملحوظ رہے کہ وحید کی عاشقی
تمنا اور آرزو کی ناتمامی کی داستان رہی ہے
اور اس سلسلے میں کسی کا یہ مصرعہ ان پر صادق
آتا ہے کہ دکھ گئی احتیاط عشق میں عمر۔

اس میں دل خون تو ضرور ہوتا رہا۔ اور یہ
خوشیاں غم تو ضرور بخشتی رہیں۔ لیکن وہ
ابتذال ان کے قریب نہیں آسکا جو کبھی کبھی
کامرانی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس میں جگر
خون جتنا بھی ہوا ہو۔ لیکن غزل کے شعر
مہک اٹھے ہیں۔ اور اس سرخوشی کے رنگ
میں ڈوب کر نکھر گئے ہیں۔ حسن کو آرزو کے مسلسل
کا عطیہ کہنا چاہیئے ہے۔[1]

ان کے مخصوص طرز کی غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں۔

رنگ لایا دوانا پن میرا سی رہے ہیں وہ پیرہن میرا
یادوں سے چراغاں ہے شبستان سخن میں
اے حسن ترے نقش قدم یاد رہیں گے
خموشی ترنم و آہستگی آداب الفت ہیں
حریم ناز میں اے شمع چل آہستہ آہستہ

[1] رشید حسن خاں "وحید کی شاعری چند اشارے" وحید شخص و شاعر
مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی۔ ۱۹۸۴ء

کوئی جلدی نہیں نشوونما کی باغ ہستی میں
مہکتے ہیں گل علم و عمل آہستہ آہستہ

نئی نظم جس طرح صرف نشاط و انبساط کو سب کچھ نہیں سمجھتی ہے اسی طرح نئی غزل بھی ہمیں حظ کے محدود حصار سے نکالتی اور رمز و ایما کی نئی سمتوں میں نئے تجسس و نئے ذہن کے ساتھ لے جاتی ہے۔ اور مانوس زبان میں ترسیل کا موقع فراہم کرتی ہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے خیال میں:

"آج کے طرز احساس سے شاعر ہم آہنگ ہو تو پرانے انداز کی غزل کہتے کہتے اسی کے اندر سے نئی غزل کا دھارا پھوٹ نکلتا ہے۔" [1]

وحید تو خیر جدید غزل کے رسیا نہیں تاہم ان کے اشعار میں جدید غزل کا لہجہ ملتا ہے۔ اور بعض ایسے بھی اشعار ملتے ہیں جو ان کے تیئیں کی نمائندگی کے لیے کافی ہیں۔ ے

[1] خلیل الرحمٰن اعظمی، نشاط شاعر، "جدید غزل" محب پبلیکیشنز نئی دہلی ۱۹۷۰ء

آگہی اپنی خطا ہو جیسے
بے بسی اسکی سزا ہو جیسے

وحید خوشیوں کے سوالوں میں ہے گم
ہر خوشی غم سے جدا ہو جیسے

کارواں لوٹ سے کوئی کیا بچتا
راہزن رہنما ہو جیسے

رات بھر خون روئے ستارے
تب سہانی سحر مسکرائی

بات کہتا ہے جو کھری اکثر
وہ بھی سنتا نہیں ہے بات کھری

اور تو آئینہ میں عیب نہیں
صاف دل ہے یہی برائی ہے

وحید نے دل حساس اور تیز پرکھنے والی نظر پائی تھی۔ ان کی بینائی کسی بھی چیز کے حسن کی تہہ تک پہنچ جاتی ہے۔ لیکن وہ اسکی قباحت سے پہلو تہی کرتے رہے۔ اس کی بھیج ورشت سے یا تو نظر پھیر لیتے یا پھر

اس کو نظر انداز کر دیتے۔ وحید اکثر چیزوں کو ٹھیک اتنے فاصلے پر رکھتے تھے جہاں سے ان کو ہر چیز کی خوبی واضح دکھائی دیتی ہر چیز کی خوبیوں کو محسوس کرنے کیلئے وہ بڑی سریع الذہنی کا ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن اسکی ضد میں انہوں نے کسی شخص یا شئے کی مذمت یا تضحیک کے لئے کبھی عجلت نہیں کی یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ایسے اشعار کا فقدان دکھائی دیتا ہے جن میں کسی کی تضحیک ہوتی ہو ڈاکٹر مغنی تبسم نے لکھا ہے۔

"اس مزاج کا خاصہ یہ ہے کہ وہ قبیح و زشت
کی طرف سے اپنی نظریں پھیر لیتا ہے یا پھر خارج
کے مشاہدے میں ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھتا ہے
کہ اشیا کو اتنے فاصلے سے دیکھا جائے کہ وہ
حسین اور دلکش محسوس ہوں" [1]

ان کی غزلوں سے ان کے فنون لطیفہ سے شغف کا راز افشا

[1] ڈاکٹر مغنی تبسم مبصر عدا ایچ ڈی ایچ ڈی نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری حیدرآباد ۱۹۸۰ء

ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر صفی الدین صدیقی :

" وحید کی غزلوں میں نرمی غنائیت اور شیرینی ہے۔ وہ مجسمہ سازی کی طرح الفاظ کو تراش کر خوبصورت بت کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں " لہ

یہی نرمی و غنائیت شیرینی اور خوبصورتی ان کی فنونِ لطیفہ سے دلچسپی کی غماز ہے۔ وحید الفاظ کے جادوگر ہیں۔ ان کو ایسے ترتیب دیتے ہیں کہ یہیں موسیقیت موزونیت اور غنائیت یکجا محسوس ہوتے ہیں۔ پیکر تراشی کے ایسے ایسے نمونے ان کے ہاں موجود ہیں کہ مصوری و سنگ تراشی بے جان معلوم ہوتی ہے۔

زندگی رقص میں ہے ساقیٔ گلفام کے ساتھ
نبضِ کونین لرزتی ہے خطِ جام کے ساتھ

ڈاکٹر رشید حسن خاں اپنے مضمون میں وحید کے شاعرانہ

لہ ڈاکٹر صفی الدین صدیقی " سکندر علی وجد شخصیت اور فن "
روزنامہ سیاست حیدرآباد

وحید کی غزلوں کی منفرد خصوصیت وہ روانی اور نغمگی ہے جو انہیں دوسرے شعراء سے تمیز کرتی ہے۔ نشاطِ خاطر کے لمحات مہیا کرنے والے اس شاعر نے اپنی غزلوں میں سماجی مفاد کو ملحوظ رکھ کر فلاح و بہبودی کے موضوعات کو نہیں سمو سکا۔ اس کے باوجود ان کے ایک ناقد دوست اشفاق حسین جو پہلے کہتے تھے کہ وحید کا شاعرانہ مزاج مخدوم کی بہ نسبت سماج کی آگ میں تپا نہیں۔ لکھتے ہیں۔

> " بیاضِ مریم کی غزلوں میں مجھے پہلی مرتبہ وحید کے کلام میں ایک قسم کا سوز و شکستگی کا احساس ہوا۔" [۱]

شکستگی کا یہ احساس انہیں تلخیٔ ایام سے ملا، کچھ زوال ریاست حیدرآباد سے، تو پھر کچھ لسانی بنیادوں پر صوبوں کی تقسیم جدید کی وجہ سے، جس کے نتیجے میں ان کے دو پسندیدہ شہر حیدرآباد اور اورنگ آباد کو دو علحدہ ریاستوں میں ضم کر دیا گیا۔ ایسے میں بھلا وحید کے دل کو کیسے ٹھیس نہ پہنچی ہو

[۱] اشفاق حسین "بیاضِ مریم" سوونیر جشنِ وحید اورنگ آباد

تجیق کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"موضوع کے لحاظ سے وہ رومانی شاعر ہیں
رقص مصوری اور موسیقی سے ان کی طبیعت
کو جو نسبت خاص ہے اس کے اثر سے
بیان میں نغمگی کی لہریں رواں دواں
رہتی ہیں بیان کے لحاظ سے نفیس تشبیہ
اور روشن استعاروں سے کام لینا ان کا خاص
انداز ہے۔ استعاروں کی مدد سے نقش اور
تصویر کے ہلکے گہرے عکس ان کے کلام میں
نمایاں رہتے ہیں" [1]

وحید اکثر مترنم بحروں کا انتخاب کرتے ہیں۔ ان کی غزلیں بقول
سردار جعفری:

"ہلکی پھلکی اور مترنم ہیں اور ان کی آواز کا
ساتھ دیتی ہیں" [2]

---

[1] رشید حسن خاں "وحید کی شاعری چند اشارے" وحید شخص وشاعر
[2] علی سردار جعفری "تبصرہ" ہفتہ روزہ بلٹز بمبئی۔

اس کے بعد مہاراشٹر کے چیف جسٹس نے ایل۔ایل۔بی کی سند نہ ہونے کی وجہ سے مزید ان کی ترقی کے راستوں کو ختم کردیا۔ بقول جناب حامد علی عباسی :

"حیدرآباد سیول سروس کی قانونی تعلیم اور
برسوں کے عدالتی تجربے کو نظر انداز کر کے
ان کو اور ان کے جیسے ہمارے بھائیوں کو اصل
محکمۂ عدالت کی خدمات سے ہٹاکر دوسری
نیم عدالتی خدمات پر منتقل کر دیا۔ کیوں کہ
ان لوگوں کے پاس قانون کی رسمی ڈگریاں نہ تھیں" [۱]

شاید یہی سرد مہری کی وجہ سے وحید نے قبل از وقت ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی۔ اور اس کے بعد یوں کہیے کہ ان کی شاعری کے سوتے بھی خاموش نہ سہی اس کی رفتار میں وہ تیزی نہ رہی۔ لیکن وحید نے اپنے دلکش اور سلونے انداز میں غزل کو جو دیا اور جو خوبصورت غزلیں لکھیں ان میں غم زمانہ کی دھڑکنیں زیادہ نہ محسوس ہوتی ہوں لیکن ایک دکھے

---

[۱] احسن علی: "اسکندر علی وجد" روزنامہ سیاست ۲۲ مئی ۸۳ء حیدرآباد

ہوئے دل کی تسکین کا سامان ضرور موجود ہے۔
احسن علی مرزا کے بموجب:

"مخدوم کی نظم ہو یا وحید کی غزل وہ وقت و
زمانہ کے قدموں کی چاپ بن جاتی ہے۔ یہ
درست ہے کہ وحید نے مخدوم کی طرح بہت
عرصہ تک "دشت سیاست" سے اپنے تلوے
لہولہان کرنے سے احتراز کیا۔" [1]

وحید کے موضوعات غزل گہرے اور گمبھیر نہیں۔ سیدھے سادے دو ٹوک دو اور دو چار والے ہیں۔ لیکن تاثیر کے اعتبار سے بے پناہ اور ایسے کہ پڑھیں اور سیدھے دلنشیں ہوں۔ ان کے ہاں فلسفہ و فکر کی زیادہ کارفرمائی نہ رہی ہو لیکن انسانی جذبات کی ترجمانی میں ان کی مثال کم ہی ملے گی پھر ان کے کہنے کا انداز مترنم بحریں، الفاظ کے انتخاب میں احتیاط اور دلکش اسلوب بحیثیت غزل گو ان کو اردو ادب میں کوئی اونچے مقام کا حامل نہ بنا دیتا ہو لیکن ایک معتبر اور موقر حیثیت کا حامل ضرور بنا دیتے ہیں۔

[1] احسن علی مرزا سکندر علی وحید "روزنامہ سیاست ۲۴ مئی ۸۳ء حیدرآباد

وحید کا مرتبہ

اردو شاعری میں

وحید کی شاعری کے اس سیر حاصل جائزے کی روشنی میں بہر صورت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو شاعری میں وحید کی آواز منفرد ہے۔ وحید کے دور میں اردو شاعری کئی رنگوں اور رجحانات سے دوچار رہی جن میں روایت سے بغاوت کی لے قدرے اونچی ملتی ہے۔ وحید کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے قطعی روایتی شاعری تو نہیں کی۔ اسی طرح انہوں نے اپنے دور کے رجحانات کا کھلے دل و دماغ کے ساتھ مطالعہ کیا اور جہاں تہاں ان سے استفادہ بھی کیا، لیکن ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے انہی رجحانات میں اردو شاعری کی نجات متصور کی ہو۔ وحید نے قدیم

وحید سے لیتے دیتے اور اپنے حسب توفیق ان سے اخذ و اکتساب کرتے ہوئے اپنی راہ آپ نکالی ہے۔ یہ درست ہے کہ ان کے ہاں کلاسیکی غزل کا ڈکشن بھی ملتا ہے۔ لیکن ان کی غزلوں کے مطالعے کے بعد کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وحید کی غزل کلاسیکیت کی آواز بازگشت ہے۔ ویسے عصمت جاوید کے اس خیال کو رد نہیں کیا جا سکتا:

"ان کے کلام میں عصری شعور عصری مسائل اور اپنے عہد کے بدلتے ہوئے حالات کا شعور اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن ان کا اظہار انتہائی نپے تلے انداز میں پورے کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ہوا ہے۔ لیکن ان کے فنی جوہر ان نظموں میں زیادہ کھلے ہیں جن کی اساس جمالیاتی فکر و احساس پر ہوتی ہے۔ ادب کی جمالیاتی قدریں سیاسی قدروں کے مقابلے میں زیادہ پائیدار ہوتی ہیں۔"[1]

---

[1] عصمت جاوید شاعر جمالیات سکندر علی وجد "وجد شاعر و شخص" مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی ۱۹۸۶ء

وحید نے غزل کو نئی تراش خراش نہیں دی اور نہ
مسائل حیات کو ایسے اپنے کلام کا موضوع خاص بنایا۔ اس
کے باوجود نہ وہ زندگی سے بے خبر ہے اور نہ زمانے سے
یہ ایسا سبب ان کی غزل موضوعات، رجحانات اور اسالیب
کا ایک دلاویز مرقع بن جاتی ہے۔ یہی حال نظم نگاری کا ہے
وحید کی منظومات مسائلی نہیں موضوعاتی ہیں۔ انھوں نے ان
موضوعات کے انتخاب میں کسی تنگ نظری اور ذاتیات کو دخیل
نہیں کیا بلکہ ان موضوعات کا انتخاب کرتے ہوئے خاصی کشادہ
دلی و وسیع النظری اور بحیثیت مجموعی ہم وطنوں کے جذبات و
احساسات کی ترجمانی کی خواہ ان کی نظمیں ایلورا، اجنتا
تاج محل ہوں یا عبدالرزاق لاری، چکبست، محمد علی جوہر،
جواہر لال نہرو، اندرا گاندھی یا ان سے ہٹ کر رقاصۂ طیبہ
پروین سلطانہ، اور نعیمہ کی موت وغیرہ وغیرہ موضوعات کا یہ
تنوع زندگی و زمانے کے مختلف رخوں سے وحید کی جذباتی
وابستگی کا اظہار ہے۔ ان موضوعاتی منظومات کا آہنگ
و اسلوب بھی روایت سے جدا اور بغاوت سے دور رہتے ہوئے

ان دونوں سے استفادے کا اظہار ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ پروفیسر عبدالقادر سروری کو "ہیئت و اظہار کو عزیز رکھنے والے اور انہیں کلاسیکی معیاروں کے ساتھ برتنے والے" وحید کے ہاں "نئے انقلابی تصورات" کی فراوانی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کلام میں ان کے پیام کے علاوہ انکا ایک مخصوص و منفرد لہجہ و طرز بیاں بھی پایا جاتا ہے۔

وحید کے کلام میں امید و رجا کی جابجا کارفرمائی ہے نشاط و انبساط کی فراوانی ان کی شاعری کو طرب و مسرت سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو انہیں دوسرے شعرائے سے ممتاز کرتی ہیں۔ وحید نہ صرف نشاط و جمال کے شاعر تھے بلکہ ایک صاحب کمال فنکار بھی تھے۔ ان کی شاعری طرب و مسرت، عمدہ شعریت کی زندہ مثال ہے جس میں مسائل دوراں اور مسائل جاناں کی آمیزش بھی ہے تصورات کی پیکر تراشی بھی ملتی ہے۔ ان کے اشعار میں فن اپنے پورے نکھار کے ساتھ منظر پر آتا ہے۔ ان کے تفکر و تصور کے پیکروں میں وہی نزاکت، وہی تاز، وہی نکھار

ستھرا لہجہ ہے۔ جو اجنتا، ایلورا کے اصنام کی تراش خراش
میں ملتا۔ یہ الفاظ دیگر ان کی شاعری نزاکت خیال کا دلآویز و
دلکش نمونہ ہے۔ جہاں موضوع کی بہ نسبت شاعر کے
خیالات کا بانکپن بڑی طرفگی سے نمایاں ہوتا اور جذبات و
احساسات کی لطیف و خوشگوار ترجمانی ہوتی ہے۔ جیسا کہ
سلیمان اطہر جاوید کا خیال ہے:

"وحید کی نظم تاج محل کا ایک مصرعہ ہے۔
"چھنتی ہے جالیوں سے نزاکت خیال کی"
یہ خود وحید کی نزاکت خیال کی کیسی دلآویز
مثال ہے"۔ ؎۱

وحید کے اشعار میں باد صرصر کی تیزی و تندی نہیں شمیم
شبنم کی خنکی ہے صریر خامہ بھی نسیم صبحدم کی طرح سبک رو
اور سحر آفریں ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور ان کا بجا و برمحل استعمال
گویا وحید کا حصہ ہے۔ صاف سلجھے ہوئے شستہ و شگفتہ
الفاظ کو بڑی شائستگی سے ترتیب دیا گیا ہے۔ وہ ایک

؎۱ ڈاکٹر سلیمان اطہر ... مطالعہ، روزنامہ منصف حیدرآباد ۱۲ جون ۱۹۸۳ء

قادر الکلام سخن ور تھے لہٰذا سخن طرازی و سخن سنجی کے فن اور الفاظ کے صحیح استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی لفظیات کا سرمایہ نئے پن اور طرحداری کا حامل ضرور ہے لیکن ان میں وہ فلسفیانہ رنگ و روش نہیں جو اقبال کے یہاں ملتا ہے۔ عزم سرشار، دولت بیدار، نقش بدیوار، چشم بیدار، سرورِ عزم و عمل، فیضِ غم آشنا، گاہ، شیوۂ اہل دل، امن کا پھول، موجِ ہلاہل، نگہ ناز، دلبر، دلباز، منچلے، مہ نوردوں، عسرتِ ناہید، یارکم سخن، لطفِ بزم راز، جیسے مرکب الفاظ کو نئی معنویت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ غرض وحید کا کلام الفاظ کا ایک خوشنما نگارخانہ ہے جہاں لفظ کی معنویت کو طرح طرح پہلو بہ پہلو بڑی خوبی سے نمایاں کیا گیا ہے۔ اور شعبہ عدل و انصاف سے ان کا اتصال بھی ان کے فن پر کافی اثر انگیز ثابت ہوا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کے بموجب:

"لفظ کی مزاج شناسی اور اس کا برجستہ استعمال وحید کے اشعار کو صوری حسن اور معنی آفرینی عطا کرتا ہے وحید کہتے ہیں کہ میں نے قانون سے لفظ کا

احترام اور محتاط استعمال سیکھا ہے" [1]

اس اقتباس کو ڈاکٹر صفی الدین صدیقی کے الفاظ سے مزید تقویت ملتی ہے۔ جو وحید کے ہم وطن بھی ہیں۔

"وحید کو میں نے یہ کہتے سنا ہے۔ اس پیشہ کا مثبت اور صحتمند اثر مجھ پر یہ پڑا ہے کہ ہر تخلیق کی تکمیل پر میں یہ دیکھ لیا کرتا ہوں کہ آیا میں نے موضوع سے پورا پورا انصاف کیا ہے یا نہیں" [2]

وحید کے اشعار میں الفاظ نگینوں کی طرح ترشے تراشے بڑے ہی سلیقے سے سجے دکھے نظر آتے ہیں۔ سادگی و پرکاری جوان کا خاصہ ہے وہ خود وحید کے رکھ رکھاو تہذیبی رچاؤ اور انکی نظرداری کا آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید رقمطراز ہیں:

"وہ اپنے تخیل کی لالہ کاری سے ماضی کی مصوری کرنے میں غیر معمولی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں"

---

[1] ڈاکٹر سیدہ جعفر "وحید کی نظم نگاری" وحید شاعر و شخص" مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی ۱۹۸۰ء

[2] صفی الدین صدیقی سکندر علی وحید شخصیت اور فن روزنامہ سیاست حیدرآباد ۱۸ مئی ۶۷ء

الفاظ کی تراش خراش پر ان کی توجہ خوب

ہوتی ہے۔ اور قدرتِ کلام کے باعث روانی

فصاحت دیدنی ہے۔" لہ

فصاحت، لطافت اور شعریت کے امتزاج کے ساتھ

صاحبِ شعر کا خونِ دل شعر میں شامل ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

وجد کی شاعری جلد ہی مقبولیت کے اوج پر پہنچ گئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین

اپنے ایک مکتوب موسومہ وجد مورخہ ۱۷ر دسمبر ۱۹۵۷ء میں

لکھتے ہیں:

"نقاد نہیں ہوں مگر الفاظ کی نبضوں میں خونِ جگر

رواں ہو اور کسی نے ہر شعر میں دل و ذہن کی دھڑکن

بھر دی ہو تو نقاد نہ ہوتے ہوئے بھی یہ لیسند نہیں

آتے جی میں اتر جاتے ہیں۔" لہ

یہ منظرِ دلکش کہیں دیکھا کبھی نہ ہوگا

الفاظ کی نبضوں میں رواں خونِ جگر دیکھ

لہ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید "تنقیدِ شعر"، نیشنل بک ڈپو چار کمان حیدر آباد ۱۹۷۱ء

لہ ذاکر حسین مکتوب بنام وجد مورخہ ۱۷ر دسمبر ۱۹۵۷ء

کہاں شوق و آرزو عیاں ہے حرف حرف سے
جواں تخیلات کی لطافتیں لیے ہوئے

وحید کے کلام کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے جیسے وحید نے
شاعری نہیں کی بلکہ تبسم حیات و جمال کائنات کے حسین حوادثات
و خجستہ واردات کو یکجا کر دیا ہے۔ گلستان حیات کی بہار غم گلشن
اور چمن امید کے صف سرو سمن خوبی بزم ہستی و رونق عالم کو گلستان
سخن سے روشناس کیا۔ ان کے کلام کا ہر مصرعہ ہر لفظ شان جمالی
کا مظہر ہے۔ انھوں نے چونکہ اپنی شاعری کی اساس خوب سے
خوب تر پر رکھی تھی لہٰذا وہ ہر کس و ناکس کو خوشنما نظر آتی ہے
اور قاری دیکھنے سننے اور پڑھنے غرض ہر فعل میں سرور شادمانی
طرب و نشاط مسرت و انبساط محسوس کرتا ہے اور اسکو یہ
کلام فطرت کے جان کی تراوش کا نکھرا ستھرا مرقع نظر آتا ہے۔

ان جمالیاتی پہلوؤں کے ماسوا وحید کے کلام میں حیات
و کائنات کے دیگر مسائل بھی اپنے وجود کی نمائندگی کرتے ہیں۔
وحید حسن پرست و حسن پرکھ نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ حساس
دل بھی رکھتے تھے لہٰذا ان کے کلام میں عصری حسیت کا فقدان بھی

نہیں۔ ڈاکٹر عنوان چشتی لکھتے ہیں:

"ہر تخلیق خواہ کتنی ہی ذاتی اور انفرادی ہو،
اپنے عہد کے معاشی، تہذیبی، سیاسی، ادبی
تعلیمی اور فنی عمل اور رد عمل سے وابستہ ہوتی
اور اس سے نمو پاتی ہے۔ اس میں روح عصر یا
تاریخیت کسی نہ کسی حد تک جلوہ گری ہوتا
ہے۔" [1]

اس لحاظ سے بھی وحید کے کلام میں حیات و کائنات کے
مسائل کی واضح نمائندگی ملتی ہے۔ ان کا کلام مسائل حیات کا
قطعی نمائندہ نہ سہی جہاں تہاں اس کی نمائندگی ضرور کرتا ہے۔
بقول ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید۔

"سکندر علی وجد کی شاعری کا مقصد خود ان کے
الفاظ میں نہ کوئی سیاسی انقلاب ہے نہ کوئی سماجی
اصلاح اسلئے ان کے ہاں مسائل حیات کا بھرپور
تذکرہ نہیں ملتا۔ تاہم ان کا ادبی مسلک جو تکہ

[1] ڈاکٹر عنوان چشتی "تنقید سے تخلیق تک" ۱۹۷۶ء

فن برائے فن کبھی نہیں ہے۔ اسلئے مسائل حیات کی لہریں ضرور مل جاتی ہیں۔ ان کے ایسے اشعار میں دلِ وقت کی دھڑکن سنائی دیتی ہے" لہ

ہر شعر میں بھر دی ہے دلِ وقت کی دھڑکن
ہر نظم میں کیفیت صد شام و سحر دیکھ

وحید کے ہاں ہلکے پھلکے نہایت ہی لطیف موضوعات پائے جاتے ہیں چاہے وہ موضوعات قومی ہوں یا مسائلِ حیات سے متعلق انھوں نے گمبھیر اور سنجیدہ قسم کے موضوعات سے اجتناب برتا ہے۔ البتہ جیسے ہی کسی واقعے سے متاثر ہوئے اس کو اشعار کے پیرائے میں پیش کر دیا۔ یہاں کا تا اور لے دوڑی کا سماں دکھائی دیتا ہے حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ خود وحید کے الفاظ میں:

"میں اپنے فن کو دشمن کی نظر سے دیکھتا ہوں" لہ

اور آگے چل کر لکھتے ہیں:

لہ پروفیسر سلیمان اطہر جاوید "اسلوب اور انتقاد" نیشنل بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد ۱۹۶۳ء

لہ سکندر علی وجد "میں اور میرا فن" سفتہ روزہ بلٹز ۱۵ جولائی ۱۹۷۸ء بمبئی۔

"میں ہمیشہ اپنی نظموں میں ترمیم تنسیخ اور اضافے
کیا کرتا ہوں تمام فنون لطیفہ کی طرح شاعری
بھی ایک بڑا ریاض چاہتی ہے۔ اعلیٰ شاعری
کی منزل تک پہنچنے کا کوئی آسان اور قریب کا
راستا نہیں ہے" لہ

وحید کے بموجب اچھا شعر کہنے کا سلیقہ برسوں کی ریاضت و مشقت
کے بعد ہی آتا ہے۔ لہٰذا وہ اشعار کی تخلیق سے پہلے اپنے تصورات
و تفکرات کو ذہن کی بھٹی میں خوب تپنے کا موقع دیتے ہیں۔

تب گرم سخن کہنے لگا ہوں کہ میں اک عمر
جوں شمع سر شام تا صبح جلا ہوں،

فکر کی آگ میں بنتا ہے سخن
حرف پر سوز دعا ہو جیسے

شمس الرحمٰن فاروقی نے وحید کی شاعری کے ایک
حصے کو پیش یا افتادہ سطحی اور غیر قطعی شاعری سے تعبیر کیا ہے۔
ان کے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ،

لہ سکندر علی وجد میں اور میرا فن" ہفتہ روزہ بلٹز ۱۵ر جولائی ۱۹۷۸ء بمبئی

"شاعر کے ذہن میں اس تجسس، کرید، بے چینی
اور کرب کی کمی ہے جو اسے کسی چیز کی صوری قیمت
کو قبول کرنے سے روکتا ہے۔" ؎

وحید کے مزاج میں چونکہ فلسفہ کا دخل نہیں اس لئے ان کے کلام سے فلسفیانہ کرید و تجسس کا تقاضا کرنا مناسب نہیں۔ جس کے نتیجے میں خود اپنے ہی وجود و غیر وجود کا تنازع کھڑا ہوتا ہے۔ وحید نے محض نشاط خاطر کے لئے شاعری کی ہے اور خود ان کے خیال میں ان کی شاعری تاریخی، سیاسی واقعات اور فنون لطیفہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس سے انہیں خود پورا اطمینان حاصل نہیں ہوا۔ ایسی شاعری کو کسی دوسرے چوکھٹے میں کسنے سے بھلا کیا حاصل۔ جس شاعر کو خود یہ احساس ہو کہ اس کی تخلیق وقت کے حوصلوں ضرورتوں اور آرزوؤں کی پوری ترجمان نہیں، اس پر الزام طرازی بے جا ہے۔ ہر تخلیق چاہے کتنی ہی ذاتی و نجی ہو زمانے سے دور نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح وہ چاہے کتنی ہی اجتماعی ہو اس میں ذات و صفات کے پرتو نظر آتے ہیں۔ جن میں شعریت، موسیقیت، غنائیت

؎ شمس الرحمٰن فاروقی "فاروقی کے تبصرے" شب خون کتاب گھر الہ آباد ۱۹۶۷ء

کلاسکیت، رومانیت اور فصاحت کی خوش رنگ آمیزش ہے۔ ان کا کلام ایک معجون ہے دکن کی شعری روایات کا، اور وہ اس روایت کے مخصوص نمائندہ ہیں جس کو ہردم اپنے ورثہ کا خیال و احترام تھا۔ اس ضمن میں رشید حسن خاں کا یہ قول برمحل رہے گا۔

"شدید جمالیاتی احساس مسرت اور لذت کے حصول کا جذبہ بے اختیار اور نغمگی و نقش کاری کی پرستش دکن کے ایک البیلے فرمانروا قلی قطب شاہ کی ذات میں یہ اجزا بے مثال توازن کے ساتھ اس طرح یکجا ہو گئے تھے کہ اس کی ذات ادبی جمالیات کا نگار خانہ بن گئی تھی۔ یہ نور جھین جھین کر اس علاقے میں برستا رہا ہے۔ اور واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس قطب شاہی روایت کا کچھ نہ کچھ حصہ دکن کے کئی شاعروں تک پہنچا ہے اور ہمارے زمانے میں اس فہرست میں وحید کا نام سرِ فہرست نظر آتا ہے۔" [۱]

۱۔ رشید حسن خاں "وحید کی شاعری چند اشارے" وحید شاعر و شخص مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی ۱۹۷۸ء

وحید نے کھولے "انقلاب" آخری نعرہ ملبہ بلبلہ کیا اور ریت ہی شاعری میں نئے حیرت انگیز اور چونکا دینے والے تجربے کیے۔ ان کی شاعری بے دھڑک جذبات کی مظہر بھی نہیں۔ اور ساتھ ہی طنز و تلخی، شعلہ نوائی، آتش فشانی جیسے خواص سے عاری بھی ہے۔ وحید حسین خالص شعری روایت کی ترجمانی کرتے ہیں وہ بقول ڈاکٹر وحید اختر:

"کلاسکیت کو عصر حاضر کے احساس اور فکر سے بغیر کوئی مخصوص قبا پہنائے جوڑ دیتی ہے"۔ ؎

سچ تو یہ ہے کہ قانون سے ان کی وابستگی نے ان کو ادبی زمرے میں بھی قوانین و ضوابط کا پابند بنا یا اس کے ساتھ ہی ان کے مزاج کی احتیاط پسندی کو بھی ملحوظ رکھا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں روانی افکار و رومانیت کی پاسداری ملتی ہے۔ لیکن انھوں نے کلاسیکی رنگ ڈھنگ اور ہیت و صدا کو بھی برقرار رکھا یہی وجہ ہے کہ اکثر انہیں قدامت پسند کہتے ہیں ڈاکٹر وحید اختر کا یہ بھی خیال ہے۔

؎ ڈاکٹر وحید اختر "بیاض مریم کا شاعر" ہفتہ روزہ ہماری زبان نئی دہلی یکم نومبر ۱۹۷۵ء

"وہ نازم اور زبان کے معاملے میں یقیناً قدامت پسند ہیں لیکن ان کی نظموں کی روح بڑی حد تک قدامت شکن ہے" [1]

وحید کا اسلوب ایک انوکھا اسلوب نہ سہی انفرادیت کا حامل ضرور ہے۔ ان کا کلام شعریت و تغزل، تعزز و معنز کا مرکب ہے دھیما پن سرو دوسرشاری کی خرامادی، سادگی و پرکاری لطافت وصفائی اور لطافت کی بے شمار مثالیں ہیں۔ ان کے موضوعات بولتے ہوئے زندہ متحرک زلیست و زمانے سے وابستہ ہم آپ میں چلتے پھرتے رہتے بستے ہیں۔ ترسیل و ابلاغ کے معیار پر وحید کی شاعری کھری اترتی ہے۔ ان کے اشعار ابہام یا اہمال زدہ نہیں۔ انھوں نے بعض جدید شعراء کی طرح اشاریت کے نام پر بے معنویت کو بھی نہیں اپنایا ابتدائی دور میں وہ اکثر آشفتہ مزاج شاعر کی حیثیت سے نمایاں تھے لیکن یہ آشفتگی دھیرے دھیرے سنجیدگی میں تبدیل ہو جاتی ہے طبیعت کی جولانی عمر کے بڑھنے کے ساتھ گھٹتی نظر آتی ہے۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام

---

[1] ڈاکٹر وحید اختر "بیاض مریم کا شاعر" سفتہ روزہ ہماری زبان نئی دہلی یکم نومبر ۱۹۷۸ء

وحیدؔ نے سیدھے سادے انداز سے ہٹ کر معرّا اور آزاد منظومات بھی لکھی ہیں۔ لیکن وہی نکھرا ستھرا انداز وہی غنائیت اور شعریت کا امتزاج وہی کیف و سرور اور وہی تازگی و شگفتگی ان کے اشعار میں ملتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے ان کے طرز کلام و رنگِ سخن کے لئے ان کا تخلص نہایت ہی موزوں اور مناسب ہے۔ کیونکہ وحیدؔ کا کلام وجد آور ہے۔ بقول محمد طفیل صاحب:

"وحیدؔ کی شاعری وجدان کی دنیا ہے۔" [۱]

سید محی الدین قادری زورؔ کے خیال میں ان کے کلام میں:

"جذبات کی تازگی اور رنگینی نمایاں رہتی ہے۔" [۲]

اب تک قانون جیسے خشک شعبے سے فنون لطیفہ کا شاید ہی نباہ ہوا ہو لیکن وحیدؔ کو ایک قانون داں ہونے کے باوجود فنون لطیفہ سے وابستگی رہی۔ جس کا اظہار ان کے بے شمار اشعار سے ہوتا ہے۔ اگر وہ قانون سے وابستہ نہ ہوتے تو شاید یہ شغف اور نکھرتا۔ بقول شاذؔ تمکنت:

۱؎ محمد طفیل "ماہنامہ نقوش لاہور شخصیت نمبر جنوری ۱۹۵۵ء

۲؎ سید محی الدین قادری زورؔ داستان ادب حیدرآباد ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۵۱ء

"لہو ترنگ" کی شاعری وجد کو ایک جواں سال رومانی مزاج شاعر" کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ جبکہ "آفتابِ تازہ" میں ان پر قومیت و وطنیت کا جذبہ حاوی نظر آتا ہے اور ان کا عشقیہ سوز و گداز کچھ ماند پڑ جاتا ہے۔ اوراق مصور اور بیاض مریم کے منظر عام پر آتے آتے بقول ڈاکٹر مغنی تبسم:

"اس مجموعے (بیاض مریم) کے مطالعہ کرتے ہوئے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی پرانے دوست سے ملیں اور اس میں کوئی نمایاں تبدیلی محسوس نہ کریں سوائے اس کے کہ اب اسکی طبیعت میں جولانی کچھ کم ہو گئی ہے"۔ [1]

ان کی رومانی منظومات جنکو ہم عشقیہ منظومات کے زمرے میں لا سکتے ہیں "کل رات کو" "تیرے بغیر" "شباب و خواب کی دنیا" "نیلی ناگن" "حاصل عمر" "کل صبح" "آہستہ گزر" "اے دوست آج کی رات" وغیرہ ہیں لیکن ان کی ہر نظم تقریباً ہر شعر میں رومانی پہلو ضرور نکل آتا ہے۔

---

[1] مغنی تبسم۔ بیاض مریم" ماہنامہ سب رس ادارہ ادبیات اردو ٹرسٹ حیدرآباد۔ مارچ ۱۹۷۷ء

موسیقی وجد کا اہم موضوع ہے۔ انہوں نے کئی
نظمیں اس موضوع پر کہی ہیں" ۱؎

ان کی کچھ منظومات فنون لطیفہ اور خود موسیقی سے ان کے
والہانہ لگاؤ کی غماز ہیں جن میں موسیقی، طبیبہ، رقاصہ، حسینوں کا
آرٹ، مزدوروں کا پیغام، اجنتا ایلورا وغیرہ وجد نے موسیقی
کو فنون لطیفہ کی انتہا قرار دیا ہے۔

رنگ و الفاظ کے غبار سے پاک
آرٹ کی انتہا ہے موسیقی!!!

ان کی بعض منظومات جو خصوصاً فنون لطیفہ کی توصیف میں
لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر سطح آفاقیت کے حامل ہیں۔ اجنتا ایلورا
اور جامعہ عثمانیہ کے مزدوروں کا پیغام فطرتاً کسی ایک علاقہ
اور مقام کے لئے مختص نہیں بلکہ ان مقامات کی نمائندگی کرتے
ہوئے بھی دنیا کی ان عظیم الشان تعمیرات پر منطبق ہو سکتی ہیں
جن کے معماروں نے اپنے خون دل و جگر سے ان کی آبیاری کی
ہو، اور سب کے قلب و نظر کے لئے جنت کے نمونے چھوڑ گئے ہوں۔

۱؎ شاذ تمکنت بیاض مہم روزنامہ سیاست حیدرآباد ۔۔۔

ہم نے نقش ہوس خام نہیں چھوڑا ہے
کام چھوڑا ہے کہیں نام نہیں چھوڑا ہے

یہ ہر شاہکار پر منطبق ہو سکتا ہے۔ اور ہر فنکار کے لیے خراج عقیدت ان خاراشگافوں اور مصوروں کو بھی جنکے تیشے اور موقلم ایلورا کھجوراہو اور اجنتا کے نمونے بنا گئے و نیز ان مقدروں کی صناعی کے لئے بھی جو مدھورا، ارتھیشورم اہابلی پورم وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ اور ان معماروں کے لئے بھی جن کی کاوشوں نے احرام مصر، الحمرا، آمبیر کے محل، قطب مینار، مسجد قرطبہ، تاج محل، ایفل مینار جیسی مایہ ناز تعمیرات کو کرۂ ارض پر استادہ کیا ہے

ع جہاں کھینچتا رہا پتھر پہ عکس خیر و شر برسوں
اور پھر جہاں قائم رہے کی جنت قلب و نظر برسوں "

کے ذیل میں برندابن اور اور بابل کے انوکھے باغات تصور میں ابھر جاتے ہیں۔ جہاں واقعی قلب و نظر کو جنت کے نظارے دکھائی دیتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی نے اجنتا ایلورا منظومات پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:

" یہ نظمیں محض لفظی توازن اور الفاظ کے عامیانہ پن کا

مجموعہ ہیں۔ بقول ٹریل Trail ان کو پڑھ کر
کوئی پیکر ایسا نہیں ابھرتا جو چشم تخیل کو متوجہ
کرے اور نہ کوئی خیال ایسا جنم لیتا ہے جو ذہن میں
جڑ پکڑ لے۔" ۱؎

اس طرح کی تنقید کرنے سے پہلے ناقد کو چاہیئے تھا کہ دیکھیں
یہ نظم کس پس منظر اور کس ماحول میں لکھی گئی ہے۔ اور اگر اس
کی اس سے بہتر ترجمانی ہو سکتی ہے۔ تو اس پر آیا اب تک
کسی دوسرے فنکار نے قلم اٹھایا ہے یا نہیں؟۔ اگر اس سے
بہتر ہونی تھی تو بھلا کیسی ہونی چاہیئے تھی؟ اگر موصوف جشن
وحید کے پیش کردہ ساز و سرود کے پروگرام میں پردۂ سیمین پر
ان مناظر کی سماعت کرتے تو ممکن ہے وہ ایسی تنقید سے باز
آتے۔ اجنتا ایلورا کے غار ہماری تہذیب گزشتہ کے آئینہ دار ہیں.
وحید نے انکو بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ لیکن اسطرح مسدس
کے غار میں ان کی عظمت کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر کوئی فنکار نے کسی
شاہکار کو اپنے فن میں اسطرح پیش کرے کہ اس شاہکار کی ہوبہو

تصویر معلوم ہوتے ہوئے بھی دوسرے شاہکاروں کی نمائندگی
کرے تو یہ فنکار کی فنی چابکدستی کی دلیل ہے اور زبان و بیان پہ
اسکی فتح ہے!

وحید نے جن موضوعات پہ قلم اٹھایا ہے، اور جن جن مضامین
کو اپنے اشعار میں سمویا ہے موضوع و مضامین کے لحاظ سے اکثر
ان کے ہم عصر شعراء کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ لیکن وحید نے ان کے
ساتھ جو انصاف کیا ہے وہ شاید ہی کہیں کسی دوسری جگہ ملتا ہو۔
تاج محل پہ ساحر لدھیانوی اور وحید دونوں نے قلم اٹھایا ، دیگر
شعراء نے بھی تاج محل پہ لکھا ہے ، لیکن دونوں کی طرز ادا اور
افکار میں فرق پایا جاتا ہے۔ ساحر کے ہاں ایک تیزی ، تندی
وسر چڑھنے والا جنون اور جھنجھلاہٹ محسوس ہوتی ہے۔
جبکہ وحید کے پاس نغمگی شیرینی و سرشاری کے عناصر ملتے ہیں
اس کے علاوہ وحید کی غزل کے اشعار مخدوم ، شاہد صدیقی اور
عبدالقیوم خاں باقی کے اشعار سے موضوع و مفہوم میں ملتے
جلتے ہیں۔ لیکن وحید نے جس طرحداری سے کام لیا ہے اسکی
وجہ سے ان کے اشعار میں معنویت کی ایک نئی سطح ابھرتی اور طاری ہے

ایک اور ہی تاثر مرتب ہوتا ہے۔ ؎

مخدوم کا ایک شعر۔ آج تو تلخیٔ دوراں بھی بہت ہلکی ہے
گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

اب وحید کا شعر ملاحظہ ہو۔ ہاں اسی دور میں پینے کا مزا ہے یارو
بڑھ گئی تلخیٔ مئے تلخیٔ ایام کے ساتھ

عبدالقیوم خاں باقی کا شعر ہے۔ مجھے اب کیا ڈرائیں گے اندھیرے
چراغ دل سے آگے جا رہا ہوں

وحید نے اسی مفہوم کو ذرا اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے ؎
ڈرا سکتے نہیں خونی اندھیرے
نگاہِ بے دلاں ظلمت شکن ہے

شاہد صدیقی نے غزل میں مسائل حیات کو پیش کیا ان کا ایک شعر جس کی اساس حقیقت پر ہے ؎

عروج ماہ کو انساں سمجھ گیا لیکن
ہنوز عظمت انساں سے آگہی کم ہے

اور اب وحید کا شعر ملاحظہ ہو ؎ عالم نے یوں تو بہت عقدۂ مشکل کھولے
راز گنجینۂ فطرت کے نہاں اور بھی ہیں

وحید کے ہاں غالب، جگر، سودا کے رنگ و رس سے بھری غزلیں بھی ملتی ہیں۔ جگر کا شعر ہے ؎ ہجر سے شاد وصل سے ناشاد

کیا طبیعت جگر نے پائی ہے

اب وحید کا شعر ؎ کبھی آرام سے ناخوش کبھی تکلیف سے خوش

دل سے مجموعۂ اضداد لیے پھرتا ہوں

اس شعر میں لفظ 'کبھی' سے واقعہ کو حقیقت آمیز بنا دیا ہے۔

غالب کا شعر ؎ ہے فضا میں شراب کی تاثیر

بادہ نوشی ہے بادپیمائی !!'

اور وحید کا شعر ؎ ہوا میں کیف صہبائے کہن ہے

فضا آئینہ دار فکر و فن ہے

جیسا کہ وحید نے اپنے مضمون " میں اور میرا فن " میں لکھا ہے کہ وہ ترمیم و تنسیخ کو ضروری سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنے فن کو دشمن کی نظر سے دیکھا ہے اور بڑی فراخدلی و خندہ پیشانی سے اپنے اشعار میں رد و بدل کیا ہے۔ " اپنے کہے پر اڑنے والے شعراء میں نہیں۔ 'مستند ہے میرا فرمایا ہوا' کی تعلّی ان کے پاس نہیں۔ ایک ہیرے کی خوبصورتی اور چمک میں تراش خراش کے بعد ہی نکھار پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح فن پارے بھی کاٹ چھانٹ کے

مدارج سے ہو کر ہی مقام معراج تک جا پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کے بموجب:

"وہ کلام میں ترمیم تنسیخ اور تصحیح کے بھی قائل ہیں۔ بیاضِ مریم اور انتخاب میں ابتدائی دور کے کہے ہوئے بہت سے شعر اصلاح اور نئی آب و تاب کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وحید اس تصور کے حامل ہیں کہ خیال، ذہن و احساس کی خلوتوں میں شعلہ ریز ہو جائے اور شخصیت کی بھٹی میں تپ کر کندن بن جائے تو دلنوازی اور سحر آفرینی کے محاسن سے آشنا ہو سکتا ہے۔" ؎

رونق گلشن ہستی کسی عنواں ہونا کے مصداق وحید کی بعض منظومات ان کے مختلف مجموعہ ہائے کلام میں مختلف عنوانات کے تحت آئی ہیں۔ جیسے "آفتاب تازہ" میں ان کی "صبح نو" نظم "اوراق مصور" میں "آثار سحر" کے زیر عنوان 'چلا گیا' کل صبح کے عنواں کے تحت اور نقوش ساحل، نقش و نگار عنوان کے تحت

؎ ڈاکٹر سیدہ جعفر "وحید کی نظم نگاری" جشن وحید اورنگ آباد ۱۹۸۲ء

لکھی گئی ہیں۔ عنوان کی تبدیلی سے کوئی خاص تاثر تو پیدا نہیں ہوا۔ البتہ شاعر کی تبدیلئ طبیعت سے ہم بخوبی واقف ہو سکتے ہیں۔ اسطرح "اوراق مصور" کی بعض منظومات، بیاض مریم، اور انتخابات میں بدلے ہوئے عنوانات کے تحت نظر آتی ہیں۔ حسین کا آرٹ' حسین کی تصویریں میں بدل جاتا ہے۔ اور "گلفشاں" یا تیں ہیں کھیل' شاعر کے کھیل' اور کامیابی' عظیم کامیابی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اشعار میں حذف و اضافہ کا تعلق ہے اس سے واقعی ان کا حسن نکھر آتا ہے۔ نظم "رقاصہ" کا ایک شعر آفتاب تازہ میں یوں ہے۔ ؎

اٹھی موج جیسے کی طرح انجمن میں

بدلنے لگی کروٹیں جان و تن میں

اب اسی شعر کو اوراق مصور میں اور انتخاب میں پڑھیئے۔ ؎

اٹھی موج جیسے کی طرح انجمن میں

تڑپنے لگی بجلیاں جان و تن میں

نظم رقاصہ ہی کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔ آفتاب تازہ میں یوں ملے گا ؎

خم و پیچ و پیکر کے نازک اشارے
نئی زندگی کے مظاہر ہیں سارے

اس کو ذرا سا بدل کر اوراق مصور اور انتخاب میں اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

خم و پیچ و پیکر کے نازک اشارے
جواں زندگی کے کرشمے ہیں سارے

اس طرح وحید نے خفیف سی تبدیلی کر کے اپنی منظومات کی صوری حیثیت کو نقصان نہ پہنچاتے ہوئے بھی اس کے معنوی حسن کو نکھارا ہے۔ اس طرح کے حذف و اضافے ان کی اکثر منظومات میں پائی جاتی ہیں۔ جیسے "سیلی ناگن" عالم آشوب اے دوست نکتہ چیں، نقوش ساحل، نظیر اکبرآبادی، جگنو احتیاط، پھلواری، پیام اقبال، بشارت، کیا ہم وغیرہ۔

نظم 'تحسین ناشناس'، آفتاب تازہ سے اوراق مصور میں شامل ہوتے ہوتے تین اشعار سے محروم ہو جاتی ہے۔ جو بعد میں نئی آب و تاب اور کچھ نئے اشعار کے اضافے کے ساتھ بعنوان "ایک تبصرہ نگار کے نام" شائع ہوئی۔ حسین کا آرٹ (اوراق مصور)

سے بیاض مریم، میں حسین کی تصویریں، میں بدلنے تک کئی
اشعار کے اضافے اور کئی مصرعوں میں ردوبدل سے دوچار ہوتی
ہے۔ اس سے وحید کی سیماب صفت، بے قرار طبیعت اور خوب
سے خوب ترکی تلاش کا رجحان بھی مترشح ہوتا ہے۔

رنگ کا ہنگامہ خواب ہے کہ بیداری
پرفشاں نگاہوں میں سادگی و پرکاری (حسین کا آرٹ)

اب دیکھئے حسین کی تصویریں، ۔

آرزو کا ہنگامہ بے پیکروں کی بیداری
پرفشاں اداؤں میں سادگی و پرکاری

متذکرہ بالا پہلے شعر میں رنگ، ہنگامہ، نگاہوں اور سادگی میں "گ"
کے جا تکرار سے لیس آیا، کر کرا پن پیدا ہوتا ہے۔ اور
اب حسین کی تصویریں میں۔ آرزو کا ہنگامہ، پرفشاں اداؤں۔
اس ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ہی اس کی شعریت میں
بتدریج اضافہ ہوتا ہے۔ وحید کا مخصوص طرز اندازِ شعریت سے
بھرپور رسیلے اشعار ہر محل و موقع پر یاد کئے جاتے ہیں جگر
مرادآبادی نے کہا ہے ۔

آپکے شعر غیر فانی ہیں
حضرتِ وحید واہ کیا کہنا!

ان کے اشعار کے جمال و جلال کو دیکھتے ہوئے ان کے زیر طبع دیوان کے لئے "جمال اجنتا جلال ہمالہ" نام نہایت موزوں ہے۔ وحید کی شاعری بھی جمال اجنتا اور جلال ہمالہ کی تفسیر ہے۔ جو ان کے نقش کی طرح دیرپا و ہمالہ کی بلندی کی طرح ارفع رہے گی۔ ؎

کمند گردشِ ایام کے اسیر نہیں!
نقوش دستِ عقیدت فنا پذیر نہیں

وحید کے اشعار عقیدت کے پھول سے کم نہیں۔ برصغیر کی اس تہذیب و تمدن کی طرح جو ہمارے پیش رؤوں کی پونجی ہے ہمارے بزرگوں کا ورثہ ہے۔ اسطرح یہ اشعار بھی ہمارے بزرگ شاعر کا عطیہ و ورثہ ہیں ہمارے نام، اور ہماری بعد کی نسل کے نام۔ جب تک جامعہ عثمانیہ کی عظیم الشان عمارت قائم رہے جب تک اجنتا ایلورا کے نقش اور تاج محل باقی رہیں، اور جب تک کاروان زندگی رواں دواں رہے اور جب تک ملک کیا

جمہوریت کا بول بالا رہے، اور جب تک عظمت انسان باقی رہے وحید کے اشعار پڑھے جاتے رہیں گے۔ پرکھے جاتے رہیں گے۔ ان کے کلیات شائع ہوتے رہیں گے ادارے قائم ہوتے رہیں گے۔ سمینار نکلتے رہیں گے۔ اسی طرح وحید کی شاعری زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی اور ہمارے دل میں گھر کرتی رہے گی۔ وحید کا ارتحال شخص کا ارتحال رہا شاعر تو ہمیشہ ہم سب کے ساتھ رہینگے۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ وحید کو ان کے عہد میں وہ شہرت نصیب نہ ہوئی جس کے وہ مستحق تھے ۔

اپنی مثال شمع شب غم بسر ہوئی!
پیوند فرش خاک ہوئے تب سحر ہوئی

کتابیات

شمار نمبر	نام مصنف یا مرتب	نام تصنیف	ناشر	سن اشاعت	طبع نمبر
۱	آزاد ابوالکلام مترجمہ محمد مجیب	ہماری آزادی	اورینٹ لونگ مینس بمبئی		پہلی اشاعت
۲	اریب سلیمان	حیدرآباد کے شاعر	آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی حیدرآباد	۱۹۶۲ء	"
۳	باقی عبدالقیوم خاں اور قریشی سید معین الدین	شعرائے عثمانیہ مرقع سخن	ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد	۱۹۳۹ء	"
۴	بان ڈاکٹر گستاولی مترجمہ سید علی بلگرامی	تمدن ہند	کتب خانہ نذیریہ مسلم منزل کھاری باولی دہلی		"
۵	ثانی زرینہ	اردو شاعری کی ہندوستانی روح	نسیم بکڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ	۱۹۶۷ء	"
۶	جاوید سیدہ ضمیر النساء اطہر	اسلوب اور انتقاد	نیشنل بکڈپو مچھلی کمان حیدرآباد	۱۹۶۹ء	"

شمار نمبر	نام مصنف یا مرتب	نام تصنیف	ناشر	سن اشاعت	طبع نمبر
۷	جاوید پروفیسر سلیمان اطہر	تنقید شعر	نیشنل بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد ۔	1971	پہلی بار
۸	حامدی کاشمیری	جدید اردو نظم اور یورپی اثرات	مجلس اشاعت ادب دہلی ۔	سنہ ۱۹۶۷ء	״
۹	خاور شجاع	اردو شاعری میں تاج محل	اردو پبلیکیشنز دہلی	سنہ ۱۹۶۸ء	״
۱۰	خان محمد ساقی مستعد ترجمہ مولوی محمد فدا علی	مآثر عالمگیری	نفیس اکیڈمی کراچی پاکستان	سنہ ۱۹۶۳ء	״
۱۱	رضی الدین صدیقی	اضافیت	انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی ۔	سنہ ۱۹۷۰ء	״
۱۲	رفعت مبارز الدین	"پن چکی"	ادارۂ ادبیات اردو	سنہ ۱۹۵۶ء	״
۱۳	رفیعہ سلطانہ	فن اور فنکار	مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد ۔	سنہ ۱۹۶۱ء	״
۱۴	زور ڈاکٹر سید محی الدین قادری	اردو شاعری کا انتخاب	ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی ۔	سنہ ۱۹۶۰ء	״
	״	داستان ادب حیدرآباد	ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد	سنہ [illegible]	״

شمار نمبر	نام مصنف یا مرتب	نام تصنیف	ناشر	سن اشاعت	طبع نمبر
۱۶	زینت ساجدہ پروفیسر	حیدرآباد کے ادیب	آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی حیدرآباد۔	۱۹۶۲ء	"
۱۷	سرور آل احمد	اردو شاعری کا انتخابی سلسلہ (وحید)	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ	۱۹۶۷ء	چوتھا ایڈیشن
۱۸	سروری پروفیسر عبدالقادر	اردو کی ادبی تاریخ	مسٹر شیخ محمد عثمان اینڈ سنز	۱۹۷۵ء	پہلی بار
۱۹	"	حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی	مکتبہ ابراہیمیہ محی الدین حیدرآباد		"
۲۰	شارب ردولوی	گل صد برگ	حمید قیصر الٰہ آبادی	۱۹۶۰ء	"
۲۱	شاہد خواجہ حمید الدین	"حیدرآباد کے شاعر	آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی حیدرآباد۔	۱۹۵۸ء	"
۲۲	شمس الرحمٰن فاروقی	فاروقی کے تبصرے	شب خون کتاب گھر الٰہ آباد	۱۹۶۸ء	"
۲۳	ظ انصاری	کتاب شناسی	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی	۱۹۸۱ء	"
۲۴	ظفر الحسن مرزا	ذکر یار چلے	حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد۔	۱۹۷۹ء	"
۲۵	"	عمر گزشتہ کی کتاب	"	۱۹۷۸ء	"
۲۶	عبدالوحید	جدید شعرائے اردو	فیروز سنز پرنٹرس پبلشرز کراچی		"

۲۷ عنوان چشتی پروفیسر تنقید سے تحقیق تک عنوان چشتی دہلی ۱۹۷۴ //

۲۸ کیمبل جانسن مترجمہ عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔ نفیس اکیڈمی بلاس اسٹریٹ کراچی۔ ۱۹۶۲ء //
یونس احمر

۲۹ محمد حسن پروفیسر شعر نو ادارۂ فروغ اردو امین آباد پارک لکھنؤ ۱۹۶۱ء //

۳۰ نظر حیدرآبادی اقبال اور حیدرآباد اقبال اکیڈمی پاکستان کراچی ۱۹۶۱ء //

۳۱ مغنی تبسم حالی حیات شخصیت اور شاعری۔

۳۲ وحید سکندر علی آفتاب تازہ چیتنا پرکاشن لمیٹڈ حیدرآباد ۱۹۵۲ء //

۳۳ // انتخاب انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی ۱۹۷۷ء //

۳۴ // اوراق مصور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۶۳ء //

۳۵ // بیاض مریم // ۱۹۷۴ //

۳۶ // لہو ترنگ عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد ۱۹۷۴ //

۳۷ یوسف ناظم سائے اور ہمسائے زندہ دلان حیدرآباد ۱۹۷۵ //

۳۸ // وحید شاعر و شخص مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بمبئی ۸۴ //

رسائل وجرائد

۱۔ آج کل ماہنامہ نئی دہلی اگست ۱۹۷۱ء، مئی ۱۹۷۲ء، جون و نومبر ۱۹۷۲ء
ستمبر ۱۹۷۹ء، جون ۱۹۸۲ء

۲ اردو ادب سہ ماہی دہلی دسمبر ۱۹۵۷ء، شمارہ ۲ سنہ ۱۹۸۰ء

۳ ارمغان جشن الماس سالنامہ، حیدرآباد سنہ ۱۹۷۹ء

۴ امکان سہ ماہی بمبئی شمارہ ۱ سنہ ۱۹۸۲ء

۵ بلٹز ہفتہ روزہ بمبئی ۱۵ر جولائی اور ۲۳ر ستمبر سنہ ۱۹۷۶ء

۶ سب رس ماہنامہ حیدرآباد اگست ۱۹۷۲ء، مئی جون ۱۹۷۷ء، جنوری فروری
۱۹۸۲ء، نومبر دسمبر سنہ ۸۲ء، اپریل جون سنہ ۱۹۸۳ء

۷۔ سووینیر جشن وجد اورنگ آباد سنہ ۱۹۸۲ء

۸ سیاست روزنامہ ۲۱ر مئی سنہ ۱۹۶۷ء، ۱۷ مارچ ۱۹۷۵ء،
۲۸ر دسمبر سنہ ۸۲ء، ۱۹ مئی سنہ ۲۳ء، مئی سنہ ۱۹۸۳ء

۹ "صبا" ماہنامہ حیدرآباد دسمبر سنہ ۱۹۶۳ء

۱۰ فن اور شخصیت غزل نمبر بمبئی مارچ ۱۹۷۸ء

۱۱ کتاب نما ماہنامہ بمبئی مارچ ۱۹۸۳ء

۱۲ سیر ماہنامہ حیدرآباد مارچ ۱۹۷۷ء

۱۳ مجلہ عثمانیہ سہ ماہی حیدرآباد ۱۹۳۴ء شمارہ ۲، ۳

۱۴ منصف روزنامہ حیدرآباد ۱۲؍ دسمبر ۸۲ء، ۲۲، ۲۳؍ مئی ۱۴؍ جون ۱۹۸۳ء

۱۵ نقوش شخصیت نمبر ماہنامہ لاہور ۱۹۵۵ء

۱۶ ہماری زبان ہفت روزہ انجمن ترقی اردو ہند یکم نومبر ۱۹۷۵ء

مکاتیب وحید بنام مریم بلگرامی

" " عابد علی خاں

ڈاکٹر ذاکر حسین بنام وحید